نِیلا طوطا

نیلا طوطا

بچوں کے لئے ناول

مرکزی خیال ایک فرانسیسی ناول سے ماخوذ

راز یوسفی

۱۹۷۱

فہرست

نئے ماسٹر صاحب

یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب ہم ایک پرانے محل کے کھنڈروں میں زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا محل تھا جس کے مغربی کونے میں ایک اونچا سا مینار ابھی تک درست حالت میں کھڑا تھا۔ صدر دروازے کی دو برجیاں بھی صحیح سلامت تھیں مگر ان میں لگی ہوئی لوہے کی کھڑکیوں پر زنگ چڑھ چکا تھا۔

محل کا اندرونی حصّہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور ہر طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن کی بدبُو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔

ہماری گھوڑا گاڑی سنگِ مرمر کے ایک ستون کے پیچھے کھڑی رہتی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک تالاب تھا جس کی دیواروں میں نیلے رنگ کے پتھر جڑے ہُوئے تھے مگر کائی جم جانے کی وجہ سے اب ان کا رنگ بھی پھیکا پڑ چکا تھا اور تالاب پانی

کے بجائے گندگی سے بھرپور تھا۔

ٹُوٹ پھُوٹ کا عمل اب بھی جاری تھا۔ رات کے وقت جب کوئی اینٹ گر پڑتی یا گلا سڑا شہتیر نیچے آرہتا تو اس کے دھماکے سے ہم سب ہڑبڑا کر جاگ اُٹھتے اور پھر دیر تک نیند نہ آتی۔

دوسرے دن صبح کو میری دادی چھت سے گرے ہوئے کوڑے کرکٹ کو سمیٹ کر جگہ صاف کرتیں اور کوڑے کرکٹ میں سے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے ٹکڑے علیحدہ کر کے رکھ لیتیں کیونکہ ان سے آگ بہت اچھی جلتی تھی۔

میرے والد خانہ بدوش تھے اور خانہ بدوشوں کا کوئی گھر گھاٹ نہیں ہوتا۔ جہاں جگہ مل گئی، پڑ رہے۔ کچھ دن وہاں قیام کیا اور پھر آگے چل دیے۔ جب میں پیدا ہوا تو میرے ابّو نے ہرن مینارہ نامی گاؤں میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ گاؤں شیخوپورہ سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔

پہلے تو ہمارا ٹھکانا گاؤں کے نمبردار کے مکان کے پیچھے تھا مگر ایک دن اس نے

ہمیں وہاں سے نکال دیا اور مجبوراً میرے خاندان کو پرانے محل کے کھنڈروں میں پناہ لینی پڑی جو آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ گاؤں والے ہم پر شک کرتے تھے کیونکہ خانہ بدوشوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چور ہوتے ہیں۔

محل کے پچھلے حصّے میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اُن میں کھڑکیاں اور روشن دان ہونے کے باعث ہوا اور روشنی کا گزر نہیں تھا۔ پورے محل میں یہی دو کمرے ایسے تھے جن کی چھتیں سلامت تھیں اور جن کے نیچے ہم سردی اور دھوپ کی تکلیف سے بچ سکتے تھے۔ ان کمروں میں زنگ آلود دروازے بھی لگے ہوئے تھے۔ میری دادی اور ابّو کھلے آسمان کے نیچے رہتے رہتے اُکتا چکے تھے اس لیے ان دونوں کو یہاں آکر بڑا اطمینان ہوا تھا۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک کوئی نکالے گا نہیں، وہ یہیں رہیں گے۔

میری امّی کو بھی یہاں آکر بُہت خُوشی ہوئی تھی۔ وہ آئے دن بیمار رہتی تھیں اِسی لیے سفر سے گھبراتی تھیں۔ بچپن میں کسی بیماری کی وجہ سے وہ گونگی ہو گئی تھیں اور اس محرومی کا ان کے دل میں گہرا گھاؤ تھا۔

جب اُن پر بیماری کا دورہ پڑتا تو وہ زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر لیٹ جائیں اور کام کاج کا سارا بوجھ میری دادی کے بوڑھے کاندھوں پر آتا جس سے وہ بے حد چڑچڑی ہو جاتیں۔

ماں کی بیماری سے مجھے بھی بُہت تکلیف ہوتی۔ کیونکہ اُن دِنوں میں مجھے گھر کے کام کاج میں دادی کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ میں گاؤں کے کنوئیں سے تازہ پانی لاتا، چولھے پر چڑھی ہوئی ہانڈی کا خیال رکھتا، گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر آس پاس کے گاؤں میں جا کر تنکوں کی بنی ہوئی ٹوکریاں بیچتا جو میری دادی اور امّی بُنا کرتی تھیں۔

ہفتے میں دو مرتبہ ہم اپنے پالتو ریچھ پہلوان اور بکری مینا کے ساتھ شہر کی طرف نِکل جاتے یا کسی میلے ٹھیلے کا رُخ کرتے اور یا تماشا دِکھا کر دو چار روپے کما لیتے۔

ایک مرتبہ جب میری امّی بیمار تھیں تو شہر میں بڑا بھاری میلا لگا۔ میرے ابّو کو یقین تھا کہ اس میلے میں ہماری اچھی کمائی ہو جائے گی۔ میں نے اپنے دوست

برکت کو بتایا تو وہ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیّار ہو گیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ تمہیں میلے سے ایک خوب صورت چاقو خرید کر دوں گا۔ برکت گاؤں کے ایک زمیندار اشرف بیگ کا ملازم تھا۔ اُس زمیندار کی کئی مربّعے زمین کے علاوہ ایک بُہت بڑی حویلی بھی تھی جو سُرخ پتھّر کی بنی ہوئی تھی۔ اسی لیے گاؤں والے اُسے لال حویلی کہتے تھے۔

صُبح سویرے ہی اُٹھ کر میں کنویں کی طرف گیا اور تازہ پانی کے بھرے ہوئے گھڑے لا کر اپنی امّی کے سرہانے رکھ دیے۔ پھر بھاگتا ہوا صحن کی طرف گیا جہاں میرے ابّو موتی کو گاڑی میں جوت رہے تھے۔ موتی ہمارے گھوڑے کا نام تھا۔

ابّو نے اپنی موٹی موٹی مونچھیں مروڑتے ہُوئے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں کچھ ڈر سا گیا مگر ساتھ ہی اس خیال سے ڈھارس بندھی کہ دادی کی موجودگی میں وہ مجھ پر خفا نہیں ہوں گے کیونکہ وہ ان کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ اِتنے میں دادی غصّے میں بُدبُداتی ہوئی پہلوان اور مینا کو لے کر آ گئیں۔

”ہُوں۔ پہلوان کا مزاج ہی نہیں مِلتا۔ سارا سفر تو گاڑی میں طے کرے گا پھر بھی ہمارے ساتھ چلنے میں آنا کانی کرتا ہے۔“

دادی نے بڑی مشکل سے پہلوان کو گاڑی میں چڑھایا۔ اُن کا جسم بھاری تھا اور قد ناٹا۔ یہ تماشا دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ دادی چِڑ کر بولیں۔

”کم بخت کھڑا کھڑا ہنس رہا ہے۔ اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ پہلوان کو گاڑی میں چڑھانے میں میرا ہاتھ بٹاتا۔ میں سچ کہتی ہوں اکرم تیرا بیٹا قاسم بالکل نکمّا ہے۔“

جب پہلوان اور مینا گاڑی پر سوار ہو گئے تو میں اُچھل کر گاڑی کی گدّی پر جا بیٹھا۔ اور گاڑی ہانکنے لگا۔ گاؤں کے موڑ پر برکت کھڑا ہمارا راستہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے گاڑی روک لی اور اس کو اپنے پاس بٹھالیا۔

یہ ستمبر کی ایک سُہانی صُبح تھی اور اس وقت میری عُمر گیارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ میرے پیَر میں جوتی نہیں تھی اور میں نے اپنے ابّو کی ڈھیلی ڈھالی اور میلی سی صدری پہن رکھی تھی جو میرے گھٹنوں سے نیچے لٹک رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم میلے میں پہنچ گئے اور ایک مُناسب سی جگہ دیکھ کر ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ دادی نے ڈھولک بجائی اور بڑی سُریلی آواز میں تان اُڑائی۔ اس بڑھاپے میں بھی اُن کی آواز بڑی دِل کش تھی۔ ڈھولک پر تھاپ پڑنے کی دیر تھی کہ تماشائی ہمارے اردگرد حلقہ بنا کر اکٹھے ہونے لگے۔ جب کافی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے تو ابّو لنگوٹا کَس کر میدان میں آ گئے اور آتے ہی پہلوان کو للکارا۔

"بچّہ پہلوان، آجا اکھاڑے کے بیچ۔ میں دیکھوں تیری پہلوانی۔ بڑے بڑے سخی لوگ دُور دُور سے تیری تیری کُشتی دیکھنے آئے ہیں۔"

ابّو کی عُمر چالیس سے اوپر تھی لیکن اُن کی صحت بہت اچھی تھی۔ اُن کا بدن گٹھیلا، پھرُتیلا اور لچکیلا تھا۔

پہلوان نے ان کی آواز پر کان نہیں دھرا اور چاروں پنجوں کے بل زمین پر بیٹھا ہوا ہانپتا رہا۔ ابّو نے پھر آواز لگائی۔

”بچّہ پہلوان، اکھاڑے میں آ کر سب کو سلام کر۔ آج تُو بھُوکا نہیں رہے گا۔ کھڑا ہو جا۔“

پہلوان نے پھر بھی کوئی دھیان نہیں دیا۔ جیسے گونگا بہرا ہو۔ اس پر ابّو نے اس کی رسّی پکڑی اور کھینچتے ہوئے اکھاڑے میں لے آئے۔ انہوں نے اس زور سے اس کی پیٹھ پر لاٹھی ماری کہ وہ بلبلا اٹھا اور غصّے میں آ کر ابّو سے لپٹ گیا۔ دونوں کے درمیان زور دار کُشتی ہوئی آخر ابّو نے اسے پچھاڑ دیا۔ اس پر زور دار قہقہے لگے اور بچّوں نے سیٹیاں بھی بجائیں۔

دوسرا کرتب مینا نے دِکھایا۔ اُوپر سے نیچے لکڑی کے کئی گٹکے اس طرح رکھّے گئے کہ اُن کا ایک اُونچا سا مینار بن گیا۔ مینا اُن گٹکوں پر یوں چڑھ گئی جیسے کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو۔ آخری گٹکے پر وہ لٹّو کی طرح گھُومی اور کسی چیز کا سہارا لیے بغیر آہستہ آہستہ نیچے اتر آئی۔

جُونہی مینا نیچے اُتر کر زمین پر کھڑی ہوئی میں نے اُچھل کر اُس کی ناک کو چوما اور

لکڑی کا صندوقچہ لے کر تماشائیوں میں گھومنے لگا۔ سب نے کُچھ نہ کُچھ دیا اور پھِر چلے گئے۔ کھیل ختم ہونے کے بعد میں نے صندوقچہ دادی کے حوالے کیا اور برکت کو تلاش کرنے کے لیے ہَوا کی طرح بھاگ اٹھا۔

کُچھ دیر اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کے بعد وہ مجھے ایک مسجد کی دیوار کے پاس کھڑا ہوا مِل گیا۔ اس کے چہرے سے اُداسی ٹپک رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ تُم کُچھ اُداس نظر آرہے ہو۔" میں نے پُوچھا۔

"تم بُہت دیر سے پہنچے۔ تمہارا چاقو گُم ہو گیا ہے۔" وہ روہانسا ہو کر بولا۔

"چاقو گُم ہو گیا ہے؟ میں کُچھ سمجھا نہیں۔" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"یہ قسمت کا چکّر ہے۔" وہ بولا۔ "کسی نے میری جیب میں سے پیسے نکال لیے۔ میں تمہارے لیے چاقو نہ خرید سکا۔"

مُجھے یہ منحوس خبر سُن کر بُہت افسوس ہوا مگر میں برکت سے کیا شکایت کرتا۔

قسمت تو میری کھوٹی تھی۔

میں منہ لٹکائے واپس آیا اور گاڑی کے پچھلے حصّے میں پہلوان کی پیٹھ پر سر رکھ کر سو گیا۔ کچھ دیر بعد اچانک میری آنکھ کھُل گئی۔ اب ہم اپنے گھر واپس جا رہے تھے اور ابّو گاڑی کھڑی کر کے کسی راہ گیر سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ وہ شکل و صورت سے کوئی شریف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پنجرا تھا جس پر غلاف پڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں صندوق تھا۔

ابّو اس سے کہہ رہے تھے۔ ”مجھے تو آپ کو گاؤں لے جانے میں کوئی عذر نہیں۔ آپ ہی کو تکلیف ہو گی۔ جھٹکے لگیں گے۔“

”سامان اُٹھا کر گاؤں تک پہنچنا بہت مشکل ہے میں جھٹکے جھیل لوں گا اور تمہیں کرایہ بھی دُوں گا۔“ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔

کرائے کا سُنتے ہی دادی نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کُرتا اور لہنگا سمیٹ لیا اور اجنبی مسافر کے بیٹھنے کے جگہ بنا دی۔ ابّو نے گاڑی سے اُتر کر مسافر کا سامان پیچھے رکھا اور خود

آگے جا کر بیٹھ گئے۔

"مجھے اسٹیشن پر ہی معلوم ہو گیا تھا کہ گاؤں جانے کے لیے یہاں تانگہ وغیرہ نہیں ملتا۔ اس لیے میں پیدل چل کھڑا ہوا تھا۔" اجنبی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں دیر اس کے چہرے کی طرف تک رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح اس پرندے کو دیکھ لُوں جو پنجرے میں بند تھا۔

"آپ کہاں اُتریں گے؟" ابّو نے گاؤں کے قریب پہنچنے بعد اجنبی سے پوچھا۔

"مجھے اسکول کے پاس اُترنا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اسکول پرانے محل کے سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ اجنبی مُسافر نئے ماسٹر صاحب ہوں گے جِن کا بُہت دِنوں سے انتظار ہو رہا تھا۔ جب اسکول لے پاس پہنچے تو مائی حلیمن دروازے پر کھڑی ماسٹر صاحب کا انتظار کر رہی تھی۔

مائی حلیمن ہماری پڑوسن تھی اور اُسے مُجھ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ اسکول کی

نوکرانی تھی اور اسکول میں پڑھانے والے ہر استاد کی خدمت کرنا اس کا فرض تھا۔

جُونہی ماسٹر صاحب گاڑی سے نیچے اُترے، مائی حلیمن کی باچھیں کِھل گئیں۔ اس نے ادب سے انہیں سلام کیا اور اُن کا سامان اُٹھا کر اندر لے گئی۔

حکیم شاہ

دوسرے دن میں پرانے محل کی ایک ٹوٹی سی دیوار پر بیٹھا مینا کی اُچھل کود سے دِل بہلا رہا تھا کہ مجھے دور سے ایک آدمی محل کی طرف آتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر پتا چلا کہ وہ نئے ماسٹر صاحب تھے۔ نہ جانے اُنہیں دیکھتے ہی میں کیوں گھبرا گیا اور سر پر پاؤں رکھ کر اندر کی طرف بھاگنے لگا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ گھبراہٹ میں دادی سے ٹکرا گیا جو پہلوان کے لیے چارہ لارہی تھیں۔

"نظر نہیں آتا؟" دادی غصّے سے بولیں۔

"اُدھر دیکھیے ماسٹر صاحب اسی طرف چلے آرہے ہیں۔" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دادی حیران ہو کر ماسٹر صاحب کی طرف دیکھنے لگیں۔ مُجھے موقع مل گیا اور میں بھاگ کر کمرے میں جا چھپا۔ ماسٹر صاحب کا ہمارے گھر میں آنا عجیب سی بات تھی۔ بھلا ہم جیسے غریب خانہ بدوشوں کے گھر

میں کون آتا ہے۔ دادی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ ماسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر دادی کو سلام کیا۔ دادی کھوئے کھوئے سے انداز میں ہکلاتے ہوئے بولیں۔

"آپ کتنے اچھے ہیں ماسٹر جی کہ خود چل کر ہم غریبوں کے گھر آئے ہیں۔"

"کیا آپ لوگ یہاں رہتے ہیں؟" ماسٹر صاحب نے دریافت کیا۔

"ہم خانہ بدوشوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ جہاں سر چھپانے کو جگہ مل گئی، پڑ رہے۔" دادی نے جواب دیا۔

"میں سمجھا تھا یہ پرانا محل خالی ہو گا۔ جبھی اِدھر آ نکلا تھا۔ پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے۔۔۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا اور چھڑی گھماتے ہوئے واپس چلے گئے۔

دادی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وُہ بُرا سامنہ بنا کر اندر چلی گئیں۔

گاؤں کی تنگ و تاریک گلیوں میں کچھ دیر گھومنے کے بعد وہ اس راستے پر ہو لیے جو چوک کی طرف جاتا تھا۔ کچھ دیر تک ان کا پیچھا کرنے کے بعد میں برکت سے ملنے کے لیے جنگل کی طرف چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس وقت جنگل میں بھیڑ بکریاں چرا رہا ہو گا۔

میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ برکت ایک برگد کے نیچے اُونچے سے ٹیلے پر بیٹھا بانسری کی تانیں اڑا رہا تھا۔ اس کا چہرہ راکھ سے اٹا ہوا تھا۔

"یہ تمہارے چہرے پر راکھ کس نے مل دی ہے برکت؟" میں نے حیران ہو کہ پوچھا۔

"ابھی بھُٹّے بھُون کر فارغ ہوا ہوں۔ ذرا ٹھنڈے ہو جائیں تو پھر مزے لے لے کر کھاؤں گا۔" اس نے بانسری کو ایک طرف رکھتے نے کہا۔

بھُٹّوں کی سوندھی سوندھی خُوش بو سے میری بھوک چمک اُٹھی۔ میں نے اس سے پوچھے بغیر ایک ساتھ کئی بھُٹّے اُٹھا لیے اور کھاتا ہوا بولا۔

”میں نئے ماسٹر صاحب کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ کل ہی ہماری گاڑی میں سوار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔“ میں نے برکت کو چونکانے کے لیے تازہ خبر سُنائی۔

”مجھے معلوم ہے۔ وہ لاہور سے آئے ہیں۔“ برکت لاپروائی سے بھُٹّے کے دانے چباتا ہوا بولا۔

”تمھیں کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے حیرانی سے پُوچھا۔

”نمبر دار کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے بھی سُن لیں۔ بھئی اپنی تو قسمت ہی بُری ہے۔ نہ جانے یہ نئے ماسٹر صاحب کہاں سے آ ٹپکے ہیں؟ میرا تو خیال تھا کہ پرانے ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد اب کوئی اِدھر کا رُخ نہیں کرے گا۔“ برکت بڑی مایوسی کے ساتھ بولا۔

”مگر تمھیں اس سے کیا فرق پڑے گا؟ تم نے تو اب پڑھنے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”یہی تو آفت ہے۔ مجھے تو لکھنا پڑھنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ مگر برا ہو مولوی

صاحب کا۔ انہوں نے کل ہی میرے باپ کو یہ پٹّی پڑھائی ہے کہ وہ مجھے پھر پڑھنے کے لیے بھیجیں اور میرا باپ ان کی بات کبھی نہیں ٹال سکتا۔"

"تو جان کیوں نکلی جا رہی ہے۔ اچھی بات ہے۔ لکھو گے پڑھو گے بنو گے نواب۔" میں نے کہا۔

"خاک نواب بنوں گا۔ پیٹ بھر کر کھانا تو نصیب ہوتا نہیں۔ تم بڑے خُوش نصیب ہو یار کہ تمہیں لکھنے پڑھنے کے لیے کوئی مجبور نہیں کرتا۔ کاش میں بھی تمہاری طرح کسی خانہ بدوش کا بچّہ ہوتا۔ لکھنے پڑھنے کی مُصیبت سے تو جان بچ جاتی۔"

"خدا کا شکر کرو برکت کہ تُم مجھ سے بہت اچھے ہو۔ تم کیا جانو کہ گاؤں کے بچّے مُجھے کتنا حقیر سمجھتے ہیں؟ جب وہ مجھے چور کا بیٹا کہہ کر میرا مذاق اڑاتے ہیں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتا ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے اتنا غم غُصّہ آیا ہے کہ میں اُن سے گتھم گتھا ہو جاتا ہوں۔"

برکت نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموشی سے بھُٹّے کھاتے رہے۔ اچانک مجھے ماسٹر صاحب کے پنجرے کا خیال آ گیا۔ میں نے بڑی مایوسی سے کہا۔

”اگر میرے پاس صاف سُتھرے کپڑے ہوتے تو میں ایک مرتبہ اسکول جا کر وہ پرندہ ضرور دیکھتا جو ماسٹر صاحب نے پنجرے میں بند کر رکھا ہے۔ جانے وہ طوطا ہے یا مینا۔ میں نے دو تین دفعہ ماسٹر صاحب کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی مگر مائی حلیمن نے مجھے بُری طرح دھتکار دیا۔ اس ظالم عورت کے ہوتے مجھے اپنی دال گلتی نظر نہیں آتی۔“

برکت میری بات سُن کر بُہت حیران ہوا۔ بولا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں دیکھ لوں گا۔ پھر تمہیں بتاؤں گا کہ پنجرے میں طوطا ہے یا مینا۔“

برکت کے اس وعدے سے مجھے اطمینان ہو گیا اور میں وہاں سے چل دیا۔ مجھے گھر جانے کی کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ اس لیے میں حکیم شاہ کی جھونپڑی کی

طرف چل دیا جو وہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔

حکیم شاہ گٹھے ہوئے بدن کا ٹھگنا سا آدمی تھا۔ اور جنگلی جانوروں کا پرانا شکاری تھا۔ کسی زمانے میں وہ خان بہادر عظمت خان کا ملازم رہ چکا تھا مگر جب سے اس خاندان پر مصیبت آئی تھی اور اس کے بچے کھچے لوگ اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں باہر چلے گئے تھے تو حکیم شاہ کا کوئی سہارا نہیں رہا تھا۔ اب لے دے کر شکار پر ہی اس کا گزارہ چل رہا تھا۔

اُس وقت حکیم شاہ اپنی جھونپڑی میں نہیں تھا۔ اس لیے مجھے باغ کی طرف جانا پڑا کیونکہ اس سے ملنے کے یہی دو ٹھکانے تھے۔ وہ مجھے باغ میں مل گیا۔ وہ تیز ہوا کے جھونکوں سے زمین پر گرے ہوئے ٹماٹر کے پودوں کو درست کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے ہونٹ سکیڑ کر بولا۔ ”کہو، اچھے تو ہو قاسم۔ میں نے سُنا ہے تم اسکول میں پڑھنے جایا کرو گے؟“

"تمھیں کس نے بتایا؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کسی نے بھی نہیں۔ مگر کل ہی تو تمھارا باپ نئے ماسٹر کو اپنی گاڑی میں بِٹھا کر یہاں لایا ہے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اس طرح اس کا بیٹا بھی لکھ پڑھ کر پٹواری بن جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھٹے ہوئے بانس کی طرح زور زور سے ہنسنے لگا۔

"تم ہمیشہ اُلٹی سیدھی باتیں ہی سوچتے ہو۔ کبھی کوئی اچھی بات بھی سوچ لیا کرو۔" میں چِڑ کر بولا۔

"حکیم شاہ اگرچہ عمر میں مجھ سے بہت بڑا تھا لیکن میں اُس سے ہم عُمر دوستوں کی طرح بُہت کھُل کر باتیں کر لیتا تھا اور وہ بھی میری کسی بات کا بُرا نہیں مانتا تھا۔

"ارے ارے تم تو ناراض ہو گئے۔ میں تو تمھیں یوں ہی چھیڑ رہا تھا۔ میں خوب جانتا ہوں۔ اکرم خانہ بدوش کا لڑکا کبھی لکھنے پڑھنے کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ اور لکھ پڑھ بھی جائے تو پٹواری نہیں بن سکتا۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا مگر نجانے کیوں مجھے اس وقت اس کا

پاگلوں کی طرح ہنسنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس نے شاید میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے میرے دِل کی بات بھانپ لی وُہ مجھے خُوش کرنے کے لیے بولا۔

"کل میرے پاس آنا۔ جنگل کی سیر کو چلیں گے اور تیتروں کا شکار بھی کھیلیں گے۔ آؤ گے نا؟"

میں "ہوں" کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔

اسکول میں

جب سے برکت نے اسکول جانا شروع کیا تھا میں اس کی صُورت تک دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ وہ دِن بھر اسکول میں رہتا تھا اس لیے اُسے بھیڑ بکریاں چرانے کے لیے جنگل میں جانے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس نے ابھی تک ماسٹر صاحب کے پرندے کے بارے میں بھی اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔ اور میری یہ اُلجھن ابھی تک دُور نہیں ہوئی تھی کہ ماسٹر صاحب کے پنجرے میں طوطا ہے یا مینا؟

ایک روز میں پہلوان اور مینا کو سیر کرانے کے لیے پُرانے محل سے باہر نِکل رہا تھا کہ اسکول سے بچّوں کا شور سُنائی دیا۔ اسکول ہمارے محل سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا درمیان میں ایک گلی تھی اور کچھ تھوڑی سی کھلی جگہ۔ برکت بھی انہی بچوں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ان ہشّاش بشّاش بچوں کو دیکھ کر میرے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی۔ کاش میں بھی ان بچوں میں سے ایک ہوتا۔ میرے بدن پر بھی صاف سُتھرے کپڑے اور پاؤں میں جوتے ہوتے۔

پھر میں اب تک ماسٹر صاحب کا وہ پرندہ بھی دیکھ چکا ہوتا جس کے خیال نے میری راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

پہلوان چُپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور مینا چھلانگیں لگاتی ہوئی آگے جا رہی تھی۔ پہلوان جنگل میں سرسراتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے بہت خوش ہوتا تھا مگر نہ جانے کیوں، چپ چپ سا تھا۔ شاید مجھے اداس دیکھ کر وہ بھی اداس ہو گیا تھا۔

میں کچھ زیادہ دور نہیں گیا اور وہیں سے گھر کی طرف واپس چل دیا۔ آج میں ماسٹر صاحب کا پرندہ دیکھنے کے لیے سخت بے چین تھا مگر یہ شوق پورا کرنے کی کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اس چھوٹے سے کمرے میں پہنچا جہاں ابّو سوتے تھے۔ وہاں مجھے ان کے چپّل دکھائی دیے جن کا تلا ٹائر کے ربڑ کا بنا ہوا تھا۔ میں نے انہیں پہن کر دیکھا مگر وہ بہت بڑے تھے۔ مجھے سخت غُصّہ آیا۔ میں نے انہیں اُتار کر

صحن میں پھینک دیا۔

اُسی وقت مجھے ابّو کی آگے پیچھے کئی آوازیں سنائی دیں۔ وہ مجھے بُلا رہے تھے۔ مجھے اتنا غُصّہ آ رہا تھا کہ میں نے ان کی کسی آواز کا جواب نہیں دیا اور بُت بنا کھڑا رہا۔ پھر میں نے زمین پر گھسٹتے ہوئے گاڑی کے پہیّوں کا شور سنا۔ شاید وہ کہیں باہر جا رہے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب میں شام تک کے لیے آزاد تھا۔ عام طور پر میرے گھر والے جب باہر جاتے تھے تو شام پڑنے سے پہلے نہیں لوٹتے تھے۔

ابّو کے جاتے ہی میری آنکھوں میں چمک آگئی اور میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ میں اسی وقت گول کمرے کی چھت پر چڑھ کر گُنبد میں داخل ہو گیا اور ایک موکھے سے ماسٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ دیکھنے لگا۔ اس وقت نو بجے ہوں گے۔ مائی حلیمن ہاتھ میں ایک ٹوکری تھامے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

موقع بہُت غنیمت تھا۔ میں فوراً ہی گنبد سے نیچے اُتر آیا اور گلی میں بھاگتا ہوا ماسٹر

صاحب کے مکان کے پاس پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے دروازہ کھلا تھا۔ شاید مائی حلیمن تالا لگانا بھُول گئی تھی۔ میں سوچے سمجھے بغیر دھیرے سے دروازہ کھول کر مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بھاگتا اُس کمرے میں پہنچ گیا جہاں وہ پنجرا کھونٹی میں لٹک رہا تھا۔

پنجرے کو دیکھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بڑی پھرتی تے پنجرے کا غلاف ہٹایا اور اس پرندے کو دیکھنے لگا جس کے لیے میں نے اتنا خطرہ مول لیا تھا۔

پنجرے میں گہرے نیلے رنگ کا ایک نہایت خوب صورت طوطا بیٹھا چوری کھا رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے گہرے ہرے رنگ کے بے شمار طوطے دیکھے تھے مگر یہ اُن سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ اس کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پھُدکنے لگا اور بار بار پکارنے لگا۔ ”اللہ میاں چُوری بھیج۔“

اچانک اسکول کے صحن میں کھلنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی گلی میں اسکول کے بچّوں کا شور سنائی دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسکول میں وقفے کی چھٹی ہو چُکی ہے۔ خوف سے میرا تمام جسم پسینے میں نہا گیا اور آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ میں جلدی سے ایک چارپائی کے نیچے چھپ گیا۔ اسی وقت ماسٹر صاحب دھیرے دھیرے چلتے ہوئے طوطے کے پنجرے کے پاس آئے اور دیکھ کر بولے۔

"کیا بات ہے میاں مٹّھو؟ کُچھ سہمے ہوئے دکھائی دیتے ہو؟ کیا تم پر کسی بلّی نے حملہ کیا تھا؟"

وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ گلی کے دروازے سے مائی حلیمن اندر داخل ہوئی اور تیز تیز اٹھاتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ ماسٹر صاحب نے اس سے کہا۔

"ذرا اِدھر دیکھو مائی حلیمن۔ میاں مٹّھو کی آواز کتنی بدل گئی ہے۔ اس کے پَر تیر کی طرح کھڑے ہیں۔ ضرور کوئی بلّی یا کتّا اندر آیا تھا۔"

”یہاں نہ کوئی کتّا آ سکتا ہے نہ بلّی۔“ مائی حلیمن کے کہا۔

”مگر فرش پر کسی کے پاؤں کے نشان صاف نظر آ رہے ہیں۔“ ماسٹر صاحب نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”حیرت ہے۔ میں جھاڑو لگا کر ہی گھر سے باہر نکلی تھی۔“ مائی حلیمن بولی۔

”میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم نے صفائی نہیں کی۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہارے جانے کے بعد کوئی شخص کمرے میں داخل ہوا ہے۔ تُم نے شاید دروازے میں تالا نہیں لگایا ہو گا؟“

”ہاں آج مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوئی۔ میں جلدی سے تالا لگائے بغیر ہی سودا خریدنے چلی گئی تھی۔“ وہ بولی۔

میں چارپائی کے نیچے سکڑا سمٹا بیٹھا تھا۔ اور ان دونوں کی بات چیت کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سن رہا تھا۔ میرا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے ترمرے سے ناچ رہے تھے۔ میں نے زور لگا کر سانس روک رکھا تھا۔ مگر

بد قسمتی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ انتہائی کوشش کے باوجود میں اپنی چھینک کو نہ روک سکا۔ چھینک بھی اس زور سے آئی کہ سارا کمرہ گونج اٹھا۔

پھر اچانک دو بھاری بھر کم پاؤں چارپائی کے پاس آکر رُک گئے۔ یہ ماسٹر صاحب تھے۔ انہوں نے چارپائی کے نیچے جھانکا اور بڑی ملائم آواز میں کہا۔ "باہر نکل آؤ بچّے۔"

میں سہما ہوا چارپائی کے نیچے سے دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا نکلا اور آنکھیں جھپکا کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اچھا، تو یہ تم ہو۔ کمینے۔ میں پہلے ہی تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایسا کام تمہارے سوا اس گاؤں میں اور کون کر سکتا ہے۔ چور کا بیٹا چور نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ خدا کا شکر ہے ساری الماریوں کو تالے لگا رکھے تھے اور عین موقع پر پکڑے گئے ورنہ نہ جانے کیا گُل کھلاتے؟" مائی حلیمن نے ایک سانس میں بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔ "میں سچ کہتا ہوں۔ میں یہاں چوری کرنے نہیں آیا تھا۔

میں تو صرف ماسٹر صاحب کا طوطا دیکھنا چاہتا تھا۔" میں گھگھیا کر بولا۔

"میں تمہیں خوب پہچانتی ہوں۔ اُچکّے۔ تُم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ ماسٹر جی آپ تھانے میں جا کے رپٹ لکھائیں۔ یہ تو اچھّا ہی ہوا کہ یہ عین موقع پر پکڑا گیا۔"

"ماسٹر صاحب، میں چور نہیں ہوں۔۔۔ میں چور نہیں ہوں۔ مائی حلیمن جھوٹ بولتی ہے۔" یہ سن کر مائی حلیمن نے میرے منہ پر زور کا تھپّڑ مارا۔ میں یہ بے عزّتی برداشت نہ کر سکا اور تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ ماسٹر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پاگل نہ بنو بچّے۔" انہوں نے بڑے پیار سے کہا اور پھر مائی حلیمن سے بولے۔ "ہو سکتا ہے، بچّہ سچ بول رہا ہو۔"

مائی حلیمن مُنہ ہی مُنہ میں کُچھ بُڑبُڑاتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میرے ہوش ٹھکانے لگے۔ ماسٹر صاحب نے بڑی نرمی

سے پوچھا۔ ”اچھا اب مُجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم یہاں کیوں آئے تھے؟“

”سچ کہتا ہوں ماسٹر صاحب۔ میں یہاں صرف طوطے کو دیکھنے آیا تھا۔“

”اگر یہ بات تھی تو تم میرے پاس اسکول میں آ جاتے۔ میں خُود طوطا منگوا تمہیں دکھا دیتا۔ اس حالت میں تو جو بھی تمہیں دیکھے گا چور ہی سمجھے گا۔“

”مجھ سے بھُول ہوئی۔ مگر آپ ہی سوچیں میں ننگے پاؤں اسکول کیسے آ سکتا تھا؟ آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ایک غریب خانہ بدوش کا بیٹا ہوں۔“

ماسٹر صاحب نے میرے ننگے پاؤں کی طرف دیکھا جو مٹّی میں اَٹے ہوئے تھے۔ کپڑے بھی گندے تھے۔ بدن سے بھی بدبُو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر اُن کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وُہ مُسکرا کر بولے۔

”کوئی بات نہیں۔ کل سے تم بھی سکول آؤ گے بلکہ ابھی میرے ساتھ چلو۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اسکول نہیں جا سکتا۔ ابّو یہ بات سُنیں گے تو مجھے

پیٹیں گے۔" میں نے لرزتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔وہ کچھ نہیں کہیں گے۔"

میں عجیب مُصیبت میں پھنس گیا تھا۔ بھلا مجھے سکول سے کیا واسطہ؟ میں نے تو کبھی خواب میں بھی اسکول نہیں دیکھا تھا مگر ماسٹر صاحب نے میرا کندھا اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ مجھ میں اپنا پیچھا چھڑا کر بھاگ جانے کی ہِمّت بھی نہیں تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھیل کے میدان میں لے گئے جہاں بہت سے لڑکے قطار میں کھڑے ہوئے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔

میں شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ میرے بدن پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ پاؤں ننگے تھے جن پر ڈھیروں گندگی جمی ہوئی تھی۔ چہرہ خاک دھول میں اَٹا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب نے مُجھے برکت کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ تمام بچّوں میں صرف برکت ہی ایسا تھا جو مجھ سے نفرت نہیں کرتا تھا۔

کچھ دیر میدان میں پی ٹی ہوئی۔ پھر بچّے کمرے میں واپس آ گئے اور پڑھائی شروع ہو گئی۔ میں بھی ایک بنچ کے سرے پر برکت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ماسٹر صاحب نے بلیک بورڈ پر کچھ ہندسے لکھے۔ مگر میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔ میں تو صرف انہی سِکّوں کی گنتی جانتا تھا جو پہلوان کی کُشتی کا تماشا دکھاتے کے بعد تماشائیوں سے ملتے تھے۔ وہ دیر تک جماعت کو گنتی سکھاتے رہے اور میں پاگلوں کی طرح ایک ایک بچّے کا منہ تکتا رہ۔

پھر اُنہوں نے ہندسے ہٹا کر نئ رقمیں لکھیں اور برکت کے ہاتھ میں چاک کا ٹکڑا تھماتے ہُوئے بولے۔ "یہ سوال حل کر کے دکھاؤ۔"

برکت بُت کی طرح بلیک بورڈ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں چھُوٹ رہی تھیں۔

"شاباش بیٹا، جلدی سے بتاؤ ۴x6 کتنے ہوتے ہیں؟"

مگر برکت ٹکر ٹکر دیکھتا رہا اور گونگوں کی طرح چُپ چاپ کھڑا رہا۔ جماعت میں

کھُسر پھُسر ہونے لگی۔ کُچھ بچّے آستینوں میں مُنہ چھُپا کر چُپکے چُپکے ہنسنے لگے۔ برکت کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔

"اچھا تم میں سے کون بتائے گا کہ ۴x6 کتنے ہوتے ہیں؟" ماسٹر صاحب نے جماعت سے پوچھا۔

سب کے چہروں پر مُردنی چھا گئی اور وہ بچّے جو ابھی تک برکت کا مذاق اُڑا رہے تھے بغلیں جھانکنے لگے۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں سے چار کا پہاڑا کسی کو بھی یاد نہیں۔" ماسٹر صاحب نے مایوسی سے کہا۔

"مجھے یاد ہے جناب۔" نذیر ہاتھ ہلاتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا، میرے پاس آکر سناؤ۔" ماسٹر صاحب بولے۔ نذیر نے ان کے پاس آ کہ سارا پہاڑا فر فر سُنا دیا جس سے ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے نذیر کی پیٹھ تھپکی۔ پھر برکت سے پوچھا۔

”اب بتاؤ، کتنے ہوتے ہیں؟“

مگر برکت اب بھی چُپ چاپ کھڑا تھا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

”بھئی، تُم دِل لگا کر نہیں پڑھتے۔ پورا پہاڑا سُننے کے بعد بھی مٹی کے مادھو بنے ہوئے ہو۔“

یہ کہہ کر انہوں نے عینک اُتار کر میز پر رکھی، رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پھر چاک کو میز پر رکھتے ہوئے برکت کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے ہوئے اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔

”مُجھے حساب بالکل نہیں آتا۔ اسے سمجھنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں نہیں پڑھ سکتا۔ یہ بہت مشکل ہے۔“ برکت نے میرے کان میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب نے چھٹّی کا اعلان کر دیا اور تمام بچّے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ میں ابھی برکت کے ساتھ جانے کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ ماسٹر صاحب میرے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور دھیمی آواز میں بولے۔ ”آج

دوپہر کے بعد میرے پاس آنا۔۔۔ تمہیں جوتوں کی ضرورت ہے۔۔۔ آؤ گے نا؟“

شکار

اُس دِن میں جان بوجھ کر ماسٹر صاحب کے ہاں نہیں گیا کیوں کہ مجھے حکیم شاہ کے ساتھ جنگل کی سیر کو جانا تھا۔ ہم دونوں دیر تک جنگل میں گھومتے پِھرے۔ اس روز میری طبیعت بہُت اداس تھی۔ اصل میں مُجھے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر ماسٹر صاحب نے مجھے اسکول میں داخل کر لیا تو میری ساری آزادی ختم ہو جائے گی۔ نہ گھنے جنگلوں میں شکار کھیلنے کا موقع ملے گا اور نہ صبح کے وقت دِن چڑھے تک سونے کی آزادی ہو گی۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نہیں پڑھ سکتا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ حکیم شاہ اپنی ٹیڑھی تِرچھی ٹانگوں سے جنگل کے اُونچے نیچے راستوں پہ تیزی سے چل رہا تھا اور میں گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

دیر تک چلتے رہنے کی وجہ سے ہم کچھ تھک گئے تھے۔ اس لیے کُچھ دیر ستانے کے لیے ایک اُونچے سے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ حکیم شاہ نے ایک چھوٹی سی پوٹلی

کھولتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھُوک لگی ہوگی۔“

”کیوں نہیں۔ میرا تو دم نکلا جارہا ہے۔“ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

حکیم شاہ نے پوٹلی کھولی اور میرے سامنے کھانا رکھتے ہوئے بولا۔ ”تو کھاؤ۔ میں بھی بھُوکا ہوں۔“

گھی میں چپڑی ہوئی چار پانچ روٹیاں، اچار، ٹماٹر اور پیاز کے ٹکڑے دیکھ کر میری بھُوک چمک اُٹھی اور میں اُن پر ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ ”ہائے وہ بھی کیا زمانے تھے جب دودھ اور مکھن کی ریل پیل ہوا کرتی تھی۔ اچھّے کھانے کھا کر بھینس کی طرح موٹا ہو گیا تھا۔“ حکیم شاہ کو وہ زمانہ یاد آ گیا تھا جب وہ خان بہادر عظمت خان کا نوکر تھا اور چین کی بنسری بجاتا تھا۔

خان بہادر عظمت خان اسی علاقے کے بہت بڑے جاگیر دار تھے۔ سینکڑوں بیگھے اراضی تھی۔ دُور دُور تک اُن کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ بہت خُدا ترس انسان تھے۔

کبھی کسی غریب کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، حامِد خان اور شاہِد خان۔ حامِد خان بڑے تھے اور شاہِد خان چھوٹے۔

حکیم شاہ ہمیشہ عظمت خان کے گُن گاتا تھا۔ وہ ابھی تک انہیں نہیں بھُولا تھا۔ اور جب ترنگ میں آتا تو ان کے بارے میں بے شمار قصّے کہانیاں سُنایا کرتا۔

مُجھے یقین تھا کہ وہ آج بھی ان کے متعلق کوئی نہ کوئی کہانی ضُرور سُنائے گا۔ اِسی لیے کھانا کھا کر میں پاؤں پھیلا کر زمین پر چِت لیٹ گیا اور کہانی سُننے کا انتظار کرنے لگا مگر اُس نے کوئی قصّہ نہ چھیڑا۔ چُپ چاپ بیٹا بیٹھا بچی کھُچی روٹی کے ٹکڑے چباتا رہا۔

سامنے پرانے محل کا ایک مینار اور ٹوٹی پھوٹی فصیل کے کھنڈر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ بائیں طرف اشرف بیگ کی لال حویلی تھی۔

خان بہادر عظمت خان اور اشرف بیگ دونوں ہی بڑے جاگیر دار تھے اور جس طرح ایک جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے اسی طرح ان دونوں جاگیر داروں کی

آپس میں چلتی رہتی تھی۔ دونوں کی زمینیں ساتھ ساتھ تھیں، اس لیے نہری پانی کی تقسیم کے سلسلے میں آئے دن دونوں کے نوکروں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں اور یُوں اُن کے آپس کے تعلقات روز بروز خراب ہوتے چلے گئے۔

"آج کل تو اشرف بیگ کا طوطی بول رہا ہے۔ اب اس گاؤں کا کوئی شخص اس کا مُقابلہ نہیں کر سکتا۔" میں نے حکیم شاہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"وقت وقت کی بات ہے۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔" حکیم شاہ پیاز کا ٹکڑا چباتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"جب تک یہاں خان بہادر کے خاندان کا راج رہا، اشرف بیگ کی ایک نہ چلی۔ مگر ان کے جاتے ہی اشرف بیگ کی گُڈّی چڑھ گئی۔ کِسی نے سچ کہا ہے، جب جنگل میں شیر نہ رہے تو گیدڑ بھی حکومت کرنے لگتے ہیں۔"

"مگر بہت دِنوں سے اشرف بیگ کہیں دکھائی نہیں دیا۔" میں نے کہا۔

"وہ لال حویلی چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہے۔ گاؤں کا نمبردار تو اُس کے مشورے کے

بغیر ایک قدم بھی نہیں اُٹھاتا۔"

"میں نے سُنا ہے وہ اب چل پھر بھی نہیں سکتا۔""تم نے غلط نہیں سُنا۔" حکیم شاہ بولا۔

"میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ شاہِد خان نے اُس کی ٹانگیں توڑ دی تھیں۔"

"تم نے ٹھیک سُنا ہے۔ اشرف بیگ کے نوکروں نے حامِد خان کو جنگل میں گھیر کر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ اُسی کا بدلہ لینے کے لیے شاہِد خان نے اشرف بیگ پر وار کیا۔ مگر وہ سخت جان تھا۔ بچ نکلا۔ ہاں اُسے ایک ٹانگ سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

مجھے ان باتوں سے ہول آنے لگا۔ میں نے فوراً ہی باتوں کا رُخ بدل دیا۔

"تمھیں پتا تو چل چُکا ہو گا کہ آج صبح میں اسکول گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ارے تم اسکول گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تم پڑھ لکھ کر ضرور

پٹواری بنو گے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں۔ میں پٹواری بننا نہیں چاہتا۔ لیکن پھر بھی اگر میں پڑھا لکھا آدمی بن جاؤں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟" "بس رہنے دو۔ میں نے بڑے پڑھے لکھے لوگ دیکھے ہیں۔ وہ صرف نام ہی کے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اب ذرا اپنے گاؤں کے مولوی ہی کو دیکھو۔ کتنا لکھا پڑھا آدمی ہے مگر بے چارے کی آنکھوں پر سے پہلے ہی عینک سوار ہو گئی۔۔۔ حامِد خاں کا بیٹا راشد خان، جسے میں پیار سے راشو کہتا تھا، دن رات کتابوں میں کھویا رہتا تھا۔ میں ہمیشہ اس سے کہا کرتا تھا کہ چھوٹے صاحب، کتابوں کی دنیا سے نکل کر ذرا باہر کی دنیا بھی دیکھو اور تازہ ہوا سے اپنے پھیپھڑوں کو مضبوط بناؤ۔ مگر وہ میری ایک نہ سُنتا۔ مُجھے ڈر ہے کہیں تمہاری حالت بھی راشو جیسی نہ ہو جائے۔"

"مگر میں اپنی مرضی سے اسکول کب گیا تھا۔ وہ تو ماسٹر صاحب نے مجھے زبردستی پھنسا لیا۔ میں ان کے کمرے میں چُوری چھُپے طوطا دیکھنے گیا تھا اور وہاں دھر لیا گیا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "خیر یُوں اسکول چلے جانا اور بات ہے مگر لکھنے

پڑھنے میں کیا دھرا ہے۔ ذرا میری طرف دیکھو۔ میں بالکل اَن پڑھ ہوں مگر علم کے بغیر میرے کون سے کام رُکے ہوئے ہیں۔ کیا مُجھے کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا نہیں ملتا؟ کتابوں کے چکّر میں نہ پڑنا برخوردار، ورنہ کسی کام کے نہیں رہو گے۔ پڑھنا لکھنا امیر آدمیوں کا کام ہے۔ تم ایک غریب خانہ بدوش کے بیٹے ہو۔"

میں حکیم شاہ کو اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا۔ اس کی ایک ایک بات میرے دل میں اُتر گئی اور میں نے دل میں پکّا ارادہ کر لیا کہ نہیں پڑھوں گا۔

سورج ڈُوب رہا تھا اور اس کی سنہری کرنیں شام کے دُھندلکوں میں گھُل مِل کر مٹیالے رنگ کی ہوتی جا رہی تھیں۔ ماسٹر صاحب کا مہربان چہرہ اور نیلے رنگ کا طوطا جیسی تمام باتیں میرے ذہن سے غائب ہو چکی تھیں۔ "اب ہمیں واپس چلنا چاہیے، ورنہ سردی سے میری کمر کا درد مجھے پھر تنگ کرنے لگے گا۔" حکیم شام اُٹھتے ہوئے بولا۔

میں شاید اُس دن کے بعد پھر کبھی اسکول نہ جاتا کیوں کہ حکیم شاہ کے مطابق میرے پاس تیزی سے بھاگنے والی ٹانگیں تھیں، دُور تک دیکھنے والی آنکھیں تھیں اور قینچی کی طرح چلنے والی زبان بھی۔۔۔ ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے مجھے لکھنے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر بد قسمتی سے میں زیادہ عرصے تک اس فیصلے پر قائم نہ رہ سکا۔

گرمیوں کا موسم جا رہا تھا اور گلابی جاڑوں کا موسم آ رہا تھا۔ اُس روز دِن کا کھانا کھانے کے بعد ہم سب گھر میں آرام کر رہے تھے۔ میں صدر دروازے کی کھڑکی میں بیٹھا گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر ماسٹر صاحب پر پڑی۔

وہ گلی سے گزرتے ہوئے ہمارے دروازے کے پاس کھڑے ہُوئے اور پھر ایک لمحہ رُک کر اندر داخل ہو گئے۔ اُنہیں دیکھتے ہی میرا رنگ چاک کی طرح سفید پڑ گیا۔ اگر اس وقت مجھے موقع مل جاتا تو میں فوراً ہی بھاگ جاتا۔ مگر اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے میرے پاس آئے اور بڑے پیار سے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ کر اندر لے آئے۔

"آپ وہاں نہ بیٹھیں ماسٹر جی۔ آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ مگر یہاں تو کوئی بھی جگہ آپ کے بیٹھنے کے لائق نہیں ہے۔" دادی سر جھکا کر بولیں۔

"میں بالکل ٹھیک بیٹھا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔" انھوں نے لاپروائی سے کہا۔ پھر ابّو سے بولے۔ "میں آپ سے ملنے آیا تھا۔"

میں سمجھا کہ وہ میرے اسکول نہ جانے پر ابّو سے شکایت کرنے آئے ہوں گے مگر انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اُس وقت امّی ایک قمیص کی مرمّت کر رہی تھیں۔ ماسٹر صاحب قمیص دیکھ کر چونکے تو ابّو نے امّی سے وہ قمیص لی اور ماسٹر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "قمیص کی مرمّت ہو چکی ہے۔ میں آپ کو دینے جانے ہی والا تھا۔"

"نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ہی قمیص سے اپنا کام چلا سکتا ہوں۔

یہ آپ کے کام آ جائے گی۔۔۔ میں تو صرف یہ کہنے آیا تھا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میری سب سے بڑی دولت کتابوں کا ایک صندوق ہے یا طوطے کا ایک پنجرا۔ مجھے اس بات سے بہت صدمہ پہنچا کہ میرے گھر میں ایک پھٹی ہوئی قمیص کے سوا آپ کو اور کُچھ نہ ملا۔"

اب تمام معاملہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ قمیص ابّو نے چُرائی تھی۔

مجھے ابّو کی اس حرکت پر بہت غُصّہ آیا۔ میرا جی چاہا کہ میں ان کا مُنہ نوچ لُوں۔ ماسٹر صاحب کتنے شریف انسان تھے۔ اُنہیں یہ شکایت نہیں تھی کہ ابّو نے اُن کی قمیص کیوں چُرائی۔ بلکہ اُنہیں اس بات کا صدمہ تھا کہ اُن کے گھر میں ایک قمیص کے سوا اور کچھ کیوں نہ ملا۔ کتنے عظیم انسان تھے ماسٹر صاحب۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"نہیں۔ میں آپ کی قمیص نہیں رکھوں گا۔" ابّو جھینپتے ہوئے بولے۔ "اگر آپ خود نہیں لے جائیں گے تو میں کل قاسم کے ہاتھ اسکول میں بھجوا دوں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ مگر قاسم صرف قمیص دینے ہی نہ آئے، پڑھنے کے لیے بھی آئے۔" وہ آہستہ سے بولے۔

"مُجھ سے غریب آدمی کا بچہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتا ماسٹر جی۔"

"قاسم کی تعلیم پر آپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔ اسکول میں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ رہا کتابوں کا خرچ تو وہ میں برداشت کر لوں گا۔" مگر اس کے باوجود ابّو مجھے پڑھانے پر راضی نہیں تھے۔ میں اس بات پر دِل ہی دِل میں خوش ہو رہا تھا کہ امّی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُنھوں نے دوپٹے کے ایک کونے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بڑی بے بسی کے ساتھ ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ ابّو اِن آنسوؤں کا مطلب سمجھ گئے تھے۔

"قاسم کی ماں گونگی ہے۔ بول نہیں سکتی۔ میں نے اس کے آنسوؤں سے اندازہ لگا دیا کہ وہ قاسم کو پڑھانا چاہتی ہے۔" ابّو بولے۔

"پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" ماسٹر صاحب نے خوش ہو کر پوچھا۔

ابّو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر ان کی خاموشی میں رضا مندی تھی۔ ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر ماسٹر صاحب نے امّی سے کہا۔

"بہن، کل قاسم کو اسکول ضرور بھیجنا۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ماں باپ کی غفلت کی وجہ سے اُن کا بچّہ تعلیم کی دولت سے محروم رہے۔"

میرا دل ڈوب گیا۔ میں نے چاہا کہ وہاں سے اُٹھ کر تیزی سے بھاگ جاؤں مگر ایسا کرنا مشکل تھا کیونکہ ماسٹر صاحب نے میرا کاندھا مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"کیوں بھئی قاسِم، کل اسکول آؤ گے نا؟" انہوں نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔" میں نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

اگلے روز مجھے اسکول جانا پڑا۔ پہلے دِن ماسٹر صاحب نے مجھے چھوٹے بچّوں کی جماعت میں بٹھایا اور اس جماعت کا مانیٹر بھی بنا دیا۔ جس سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں تعلیم میں دلچسپی لینے لگا۔

دو مہینے کے اندر ہی اندر میں کافی ہوشیار ہو گیا اور پھر مُجھے بڑے بچّوں کی جماعت میں داخلہ مل گیا۔

پہلے پہل تو حکیم شاہ کو میرے اسکول جانے کی خبر سے بُہت رنج پہنچا مگر میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ شکار کھیلنے میں بھی اُس کا ساتھ دیتا رہتا تھا اس لیے اس کی پریشانی ختم ہو گئی تھی۔

برکت کو اس بات کا بُہت دُکھ تھا کہ میں پڑھائی میں دلچسپی کیوں لیتا ہوں۔ میں لمبے لمبے سوال حل کرنے لگا تھا جب کہ برکت کو ابھی تک معمولی پہاڑے بھی یاد نہیں تھے۔

ایک روز جب برکت نے اسکول سے چھٹّی کی تو میرا دل بھی چھٹّی منانے کے لیے مچل گیا اور میں گھر سے نکل کر حکیم شاہ کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔

حکیم شاہ شکار پر جانے کی تیّاری کر رہا تھا۔ مُجھے دیکھتے ہی اس نے پُوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ آج تُم اسکول نہیں گئے؟“

”آج میں نے چھٹّی کی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہارے ماسٹر صاحب خفا تو نہیں ہوں گئے۔“

”نہیں۔ اب خفا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کافی لکھ پڑھ لیا ہے۔“

حکیم شاہ میرا جواب سُن کر کھکھلا کر ہنس دیا۔ بولا۔ ”صرف دو مہینے میں ہی؟ بھلے آدمی شاہِد خان نے بارہ سال تعلیم پائی مگر خان بہادر کہا کرتے تھے کہ شاہد اب تک جاہل ہے۔“

”سچ؟“

”اور کیا۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ شاہد خان خُود کہا کرتے تھے کہ ابھی اُن کی تعلیم ادھوری ہے۔“

”ہاں یہ تو بتاؤ کہ خان بہادر اور اشرف بیگ کے خاندانوں میں دشمنی کی اصل وجہ کیا تھی؟“ میں نے باتوں کا رُخ بدل دیا۔

”زمینداروں کی دُشمنی زمینوں کے لیے ہوا کرتی ہے۔ خان بہادر کے انتقال کے بعد اشرف بیگ کی گُدّی چڑھ گئی تھی۔ ایک مرتبہ موقع پا کر اس کے نوکروں نے حامِد خان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب شاہِد خان اکیلے رہ گئے تھے۔ مگر کِسی نہ کِسی طرح اُنہوں نے اشرف بیگ سے اپنی بے عزّتی کا بدلہ لے لیا۔ وہ اس کی جان تو نہ لے سکے مگر اس کو ایک ٹانگ سے ضرور محروم کر دیا۔ اس کے بعد ایک رات اشرف بیگ کے آدمیوں نے محل کو آگ لگادی۔ اس وقت میں وہیں موجود تھا۔ شاہِد خان نے محل کی دیوار سے چھلانگ لگا کر بڑی مشکل اپنی جان بچائی۔ اُن دِنوں اُن کی بھاوج بیگم زینت محل اپنے چھوٹے بچّے راشد خان کے ساتھ کراچی گئی ہوئی تھیں۔ اور یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اُن دونوں کی جان کے لالے پڑ جاتے۔“

حکیم شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور جلدی سے بولا۔ ”خیر، اِن باتوں کو چھوڑو۔ شِکار کی باتیں کرو۔ آج رات میں شِکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ ٹھنڈی راتوں میں شِکار کا بڑا مزہ آتا ہے۔ آج رات آ

رہے ہو نا؟""ضرور۔۔۔"میں نے آہستہ سے کہا اور گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہنچ کر میں نے کنویں سے پانی کا گھڑا بھرا اور ماسٹر صاحب کے گھر لے گیا۔ ہمارے کنویں کا پانی بہت میٹھا تھا جو اُنہیں بہُت پسند تھا۔ مجُھے دیکھتے ہی وہ مُسکرا کر بولے۔ "میں جانتا ہوں تم مجُھ سے آج کی غیر حاضری کی معافی مانگنے آئے ہو۔ ٹھیک ہے نا؟"

میں کچھ جھینپ سا گیا۔

"آج میں نے بچّوں کو نئے سوال سکھائے ہیں۔"

"وہ کیسے ہوتے ہیں؟"میں نے حیران ہو کر کہا۔

"کل پڑھنے آؤ گے تو سب کچھ سکھا دوں گا۔ ہاں، میرا ایک خط ڈاک میں ڈال آؤ۔"

"بہُت بہتر۔"

اُنہوں نے موم بتّی جلائی اور اس سے لاکھ پگھلا کر بند لفافے پر گرائی اور اس پر مُہر لگادی۔ پھر لفافہ مُجھے دیتے ہُوئے بولے۔

"بھاگ کر ڈاک خانے جاؤ اور لفافہ ڈاک میں ڈال دو۔ اور ہاں کل ضُرور آنا ورنہ پڑھائی کا نقصان ہو گا۔"

ایک راز

میں پہلے بھی زنگ چڑھی ہوئی جالیوں کا ذکر کر چکا ہوں جو پرانے محل کی کھڑکیوں میں جڑی ہوئی تھیں۔ یہ جالیاں بہت خوب صُورت تھیں اور میں انہیں حیرت سے تکا کرتا تھا۔ اس وقت بھی میری نگاہیں انہیں جالیوں سے ٹکرا رہی تھیں کہ اچانک کسی نے میری پیٹھ پر زور سے گھونسا مارا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گھونسا مارنے والے سے لپٹ گیا اور ہم دونوں فٹ بال کی طرح زمین پر لڑھکتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہ نذیر تھا۔ اس نے چڑاتے ہوئے کہا۔

"بُہت آپے سے باہر ہو گئے ہو۔ اب تو کسی کو اپنی پیٹھ بھی چھونے کی اجازت نہیں دیتے۔"

"پہلے بھی کسی کی ہِمّت تھی کہ مُجھے نیچا دِکھا سکتا۔" میں غرّا کر بولا۔

”ہم خُوب جانتے ہیں کہ تمہیں ماسٹر صاحب نے سر پر چڑھا رکھا ہے جبھی تم کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔“

”اور میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ تُم میرے خلاف اُلٹی سیدھی باتیں گھڑتے رہتے ہو مگر میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔“

”میں کچھ نہیں کہتا۔ تمہارا دوست برکت ہی کہتا ہے۔“

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسکول کے اکثر لڑکے صرف اس وجہ سے مجھ سے جلتے تھے کہ ماسٹر صاحب مجھ پر مہربان تھے۔ اِسی جلن سے کی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے خلاف بھی زہر اگلتے رہتے تھے۔

”تم نہیں جانتے کہ ماسٹر صاحب کتنے بڑے آدمی ہیں؟ اگر تمہیں اُن کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے تو تُم ان کے خلاف بھی ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالو۔“

”کیا وہ چین کے شہزادے ہیں؟“ نذیر نے مذاق سے کہا۔

”چین کے شہزادے تو نہیں لیکن اُن کا بُہت قیمتی راز میری مُٹھّی میں ہے۔“ میں اپنی بند مُٹھّی دکھاتے ہوئے بولا۔

نذیر نے مجھ سے ماسٹر صاحب کا لفافہ چھیننے کی کوشش کی مگر میں نے بڑی پھُرتی سے اُس جالی کے راستے اندر پھینک دیا۔

میں نے کہا۔ جاؤ اور ہمارے پہلوان سے پوچھو۔ وہ تمہیں سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دے گا۔“

میرا خیال تھا کہ وہ یہ باتیں سُن کر میرے رُعب میں آجائے گا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ میرا مذاق اُڑاتا ہوا چلا گیا۔

کسی بھید کو دل میں چھپانا کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ مجھے اسی روز ہوا۔ ماسٹر صاحب کی مُہر کے لفظوں اور نشانوں سے مُجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ ایک بہت گہرا راز تھا۔ میں نے اُنہیں پہچان لیا تھا۔ وہ سچ مُچ بُہت بڑے آدمی تھے۔

میں اُسی وقت حکیم شاہ کے پاس پُہنچا اور اس سے دریافت کیا کہ اگر راشد خان

زندہ ہوتے تو اس وقت ان کی کیا عمر ہوتی۔ مگر اس نے میری بات کو ہنس کر ٹال دیا۔ اس سے میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ شاید میرا خیال غلط ہو۔ میں بُہت دیر تک غور کرتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ ان کا نام بھی راشد خان تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان کی عمر بھی قریب قریب اتنی ہی تھی جتنی عظمت خاندان کے راشد خان کی ہو سکتی تھی۔ تیسری بات یہ کہ جب وہ پہلی بار ہمارے ہاں آئے تھے تو اُنہوں نے بتایا تھا کہ وہ وہاں پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ ان کی مُہر میں جو نِشان کھُدے ہوئے تھے وہ اُسی قسم کے تھے جیسے پُرانے محل کے صدر دروازے کی پیشانی پر کھدے ہوئے تھے۔ اِن کھُلی نشانیوں کے ہوتے ہوئے میرا اندازہ کیسے غلط ثابت ہو سکتا تھا کہ ماسٹر صاحب اسی خاندان سے نہیں ہیں جس کا کبھی یہاں طوطی بولتا تھا۔

اب میں اسی ادھیڑ بُن میں لگا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی کو یہ بھید بتا دوں تاکہ میرا پیٹ ہلکا ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے میری نگاہ برکت پر پڑی۔ وہ میرا سچا دوست تھا

اور میں اس پر بھروسا کرتا تھا۔

میں بھاگتا ہوا سیدھا جنگل میں پہنچا جہاں برکت بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔

”ماسٹر صاحب تو ہم پر مصیبت بن کر نازل ہوئے ہیں۔ نہ یہ یہاں آتے اور نہ ہمیں کتابوں میں سر کھپانا پڑتا۔“

”مگر اس میں ہمارا ہی تو فائدہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم پڑھ لکھ کر آدمی بن جائیں۔“ میں نے کہا۔

”میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ تم ان کی حمایت ضُرور کرو گے۔ تُم بڑے آدمی بننے کے خواب دیکھ رہے ہو نا۔“ وہ چڑِ کر بولا۔

”خیر اسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ماسٹر صاحب کس خاندان سے ہیں؟“ میں نے بڑی رازداری سے پوچھا۔

"میں کیا جانوں؟"

"ماسٹر صاحب عظمت خاندان سے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"عظمت خاندان سے؟" برکت نے حیرت سے کہا۔

"ہاں عظمت خاندان سے۔" میں اکڑ کر بولا۔ "اب اور بُرا کہو اُنہیں۔"

وہ دیر تک حیرت سے مجھے تکتا رہا۔

"مگر خُدا کے لئے ابھی کسی کی نہ بات نہ بتانا ورنہ ماسٹر صاحب پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔" میں اس کی مِنّت کرتے ہوئے بولا۔ برکت سے جدا ہونے کے بعد مجھے اپنی بے وقوفی پر بڑا غُصّہ آیا۔ منہ سے نکلی کوٹھوں چڑھی والی بات تھی۔ میں نے اسے یہ بھید بتا کر غلطی کی تھی۔

اگلی صبح جب میں پانی کا گھڑا لے کر ماسٹر صاحب کے ہاں پہنچا تو وہ دانے صاف کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ "پانی ٹھنڈی جگہ رکھ دو اور میرا انتظار کرو۔ میں

ابھی آتا ہوں۔"

میں پانی کا گھڑا گھڑونچی پہ رکھ کر طوطے کے پاس چلا گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اسی وقت مائی حلیمن دُھلے ہوئے برتنوں کی ٹوکری اُٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور تیوریوں پر بل ڈال کر بولی۔

"وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ماسٹر صاحب کا انتظار۔" میں نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔

مائی کی آواز سُن کر ماسٹر صاحب اندر آ گئے اور ہنس کر بولے۔ "معلوم ہوتا ہے۔ مائی حلیمن تم سے ناراض ہے؟"

"خدا جانے وہ مجھ سے کیوں خفا ہوتی ہے؟ آخر میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم اُسے تنگ بھی کرتے ہو اور معافی بھی نہیں مانگتے۔۔۔"

ابھی یہ الفاظ ان کے مُنہ میں ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے لپک

کر دروازہ کھولا۔ ایک لمبا تڑنگا دیہاتی کھڑا تھا۔ وہ دروازہ کھلتے ہی مجھے ایک طرف دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

"میں شاہد خان کی طرف سے آیا ہوں۔ خدا اُنہیں جنت نصیب کرے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی دھوتی کا پلّو کھولا اور ایک لفافہ نکال کر ماسٹر صاحب کے حوالے کر دیا۔

"تو کیا چچا جان کا انتقال ہو گیا؟"

دیہاتی نے افسوس کے ساتھ سر جھکا دیا۔ ماسٹر صاحب اُسے اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ دونوں باہر آئے تو کھلا ہوا خط ان کے ہاتھ میں تھا اور اُن کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ اجنبی سلام کر کے واپس چلا گیا۔ تب ماسٹر صاحب نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

"تمہیں پہیلیاں بوجھنی آتی ہیں قاسم؟" وہ کچھ پریشانی کے ساتھ بولے۔ اور خط

میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے خط کا ایک جملہ پڑھا۔ لِکھا تھا۔

"جس کے پاس طوطا ہے اُس کے پاس سونا ہے۔"

"اس کا اشارہ آپ کے طوطے کی طرف تو نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ یہ چچا شاہد جان کی آخری نشانی ہے۔"

"آپ کے چچا شاہد خان تھے اور اُن کا تعلق عظمت خاندان سے تھا۔ ٹھیک ہے نا؟" میں بڑے اطمینان سے بولا۔

"ہاں ہاں۔ مگر تمہیں یہ کِس نے بتایا۔" انہوں نے چونک کر پُوچھا۔

آپ کے لفافے پر لگی ہوئی مُہر نے۔۔۔ میں یہ بھید اپنے دوست برکت کو بھی بتا چُکا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت برا کیا قاسم۔ تم نہیں جانتے کہ اس بھید کے کھُل جانے سے کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے ہمارے خاندان کے بارے میں حکیم شاہ نے
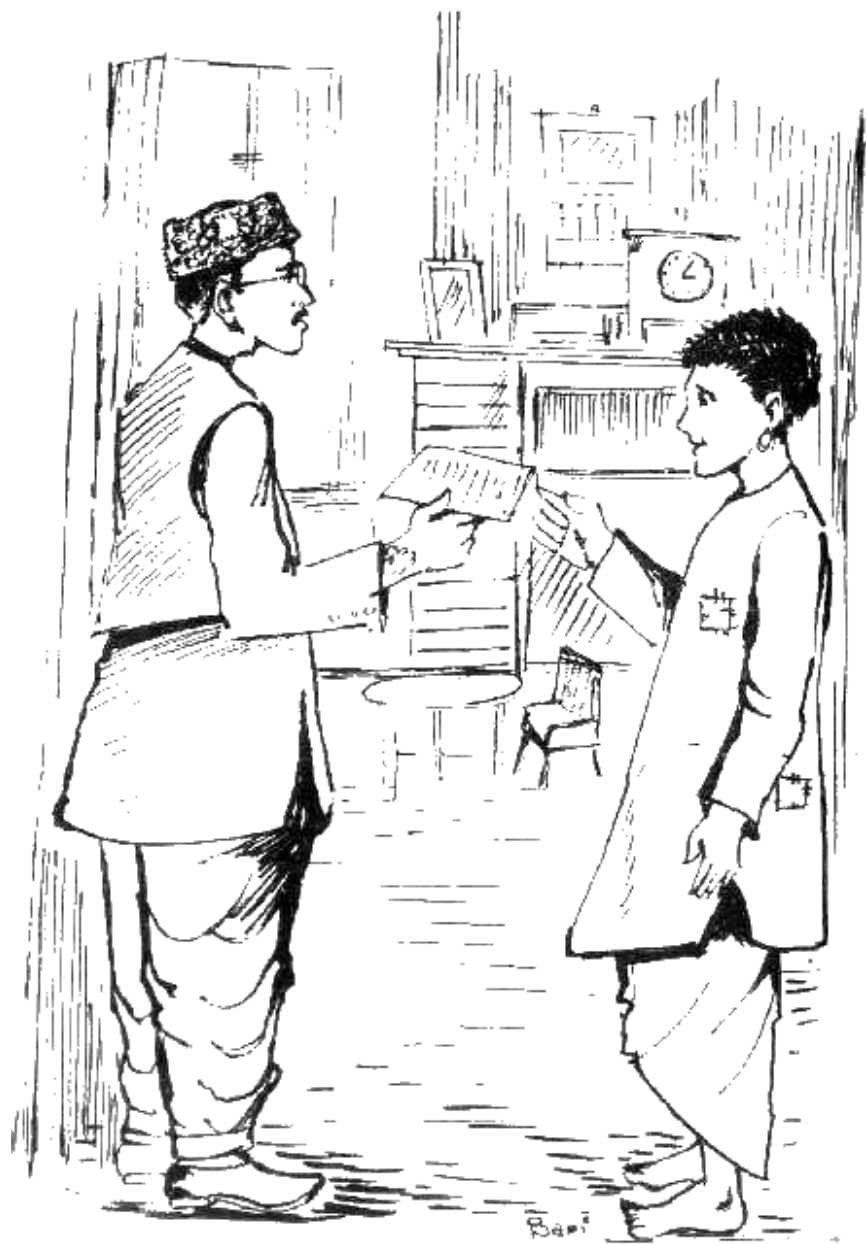
تمہیں بُہت سی باتیں بتائی ہوں گی۔ وہ بُہت عرصہ ہمارا ملازم رہ چکا ہے۔ اب میں سارا قصّہ تمہیں سُناتا ہوں۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔

”تمہیں شاید معلوم ہو کہ ایک مرتبہ میرے ابّا جان، جن کا نام حامد خان تھا جنگل میں شکار کھیلنے گئے تھے۔ وہاں کسی نے اُنہیں بندوق کی گولی سے ہلاک کر دیا تھا۔ ہمیں لال حویلی والوں پر شبہ تھا کیوں کہ ان کے سوا ہماری کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ اس وقت میری عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ امّی کو اس بات کا خوف تھا کہ کہیں دُشمن مجھے بھی موت کے گھاٹ نہ اتار دیں۔ اس لیے چچا جان کی اجازت سے مُجھے کراچی لے گئیں۔ انہی دِنوں ایک مُقابلے میں چچا جان نے اشرف بیگ کی ٹانگ توڑ دی۔ ایک روز دُشمنوں نے موقع پا کر محل کو آگ لگا دی اور آخر چچا جان کو گاؤں چھوڑتے ہی بن پڑی۔“

”کچھ دِن وہ ہمارے ساتھ رہے پھر لاہور چلے آئے اور پانچ سال تک ہمیں اُن کی

کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آخر ایک روز اچانک ان کا ایک خط ملا جس سے پتا چلا کہ انہوں نے اپنی تمام مُصیبتوں پر قابو پا لیا ہے اور اُن کی زندگی بڑے آرام سے گُزر رہی ہے۔ اُنہوں نے ہمیں بہت سا روپیہ بھیجا جس سے میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایم اے کر لیا۔"

"جب میری عمر پچیّس سال کی ہوئی تو امّی جان اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں ہر وقت اداس رہنے لگا۔ چچا جان نے مجھے اپنے پاس بلا بھیجا اور میرا دل بہلانے کے اپنے کام میں شریک کر لیا۔ وہ ایک بہت بڑے کارخانے کے مالک تھے مگر میری طبیعت وہاں اُچاٹ رہی۔ مجھے کتابوں سے محبت تھی۔ وہی میرا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ چچا جان سمجھ گئے تھے اس لیے انہوں نے دوبارہ مجھے کراچی بھجوا دیا۔ کراچی پہنچ کر میں پھر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ چند مہینے پہلے کی بات ہے کہ چچا جان نے اپنے ایک ملازم کے ہاتھ مجھے ایک خط اور ایک نیلے رنگ کا طوطا بھجوایا تھا۔ خط میں تمہیں ابھی دکھاتا ہوں۔"

وہ اندر گئے اور ایک خط لا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

”میرے پیارے بھتیجے، ہمیشہ خُوش رہو۔

میں تمہیں ایک طوطا بھیج رہا ہوں۔ یہ میری آخری نشانی ہے۔ اس کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھنا۔ یہ طوطا مجھے بے حد پسند ہے۔ میں تمہاری دیکھ بھال کے لیے ہمیشہ زندہ نہیں رہوں گا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ تمہیں بالکل بے سہارا چھوڑ کر نہ مروں۔

تم اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ وہاں ایک اسکول ماسٹر کی اسامی خالی ہوئی ہے۔ اگرچہ وہ اسامی تمہاری اعلیٰ تعلیم کے مقابلے میں بہت گھٹیا درجے کی ہے مگر تم وہاں جا کر گھاٹے میں نہیں رہو گے۔

یہ طوطا ابھی بچہ ہے، اس لیے کافی دِنوں جیے گا اور میری یاد دلا رہے گا۔

تمہارا چچا جان

شاہد خان“

”میں چچا جان کے حکم کے مطابق یہاں چلا آیا اور بچوں کو پڑھانے لگا۔“

ماسٹر صاحب کی درد ناک کہانی سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دو خاندانوں کی دُشمنی نے ایک خاندان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے دل میں اشرف بیگ کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اچانک مجھے خط کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ میں نے فوراً ہی پوچھا۔

”اس جملے کا کیا مطلب ہے کہ جس کے پاس طوطا ہے اس کے پاس سونا ہے؟“

”ہو سکتا ہے یہ طوطا کسی خزانے کا راز جانتا ہو۔“ ماسٹر صاحب نے سر ہلا کر کہا۔

”اور وہ خفیہ خزانہ آپ کے چچا جان ہی کا ہو۔“ میں نے کہا۔

مجھے اُن کے پاس بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اس لیے اجازت لے کر وہاں سے چلا آیا۔

چوری

اُس رات دادی ساری رات جاگتی رہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر پہلوان کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ دِن کے وقت کِسی ظالم نے اُسے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا۔ اگر ماسٹر صاحب فوراً ہی اس کی مرہم پٹّی نہ کرتے تو شاید زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ مر جاتا۔ پہلوان کی مرہم پٹّی سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کسی نے ان کا نیلے رنگ کا طوطا چُرا لیا ہے۔ میں یہ سُن کر سکتے ہیں آ گیا تھا۔

صُبح کے وقت جب میں سو کر اُٹھا تو سیدھا پہلوان کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی تک نڈھال پڑا تھا۔ مگر جب میں نے اُس کے سر پر تھپکی دی تو اس نے ایک آنکھ کھول کر میری طرف دیکھا۔ ابّو اُس کے پاس بیٹھے بڑے پیار سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

”حوصلہ کرو پہلوان۔ تم تو شیر سے زیادہ بہادر ہو۔ میں نے تمہارا نام یُونہی تو پہلوان نہیں رکھ دیا۔“

ناشتے میں ایک روکھی سوکھی روٹی کھاتے ہوئے مُجھے اچانک ماسٹر صاحب کا نیلا طوطا یاد آ گیا۔ میں پریشان ہو گیا اور بھاگتا ہوا اُن کے گھر پہنچا۔ کمرے میں طوطا نہیں تھا۔

ماسٹر صاحب بید کی کرسی پر بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُنہوں نے عینک اُتاری اور بڑے پیار سے پُوچھا۔ ”پہلوان کی حالت اب کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہتر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ پھر طوطے کے بارے میں پُوچھا۔ ”آپ کا طوطا کسی نے چرا لیا ہے یا وہ اُڑ کر کہیں چلا گیا ہے؟“ ”کیا وُہ پنجرے سمیت اُڑ کر چلا جاتا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”شاید چور کو کہیں سے یہ پتا چل گیا کہ طوطا سونے کی ڈلی ہے۔“

”یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ نہ طوطا سونے کا تھا اس نہ اس کا پنجرا۔“

”مگر چور یہ ضرور جانتا ہے کہ طوطے کی مدد سے شاہد خان کا پوشیدہ خزانہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ مگر میری بات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُنہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”جو دولت اپنی محنت سے کمائی جائے اُسی پر اپنا حق ہوتا ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ ہمیں اس طوطے کا کھوج لگانا چاہیے۔ اگر اُس کی مدد سے آپ کے چچا جان کا خُفیہ خزانہ مِل گیا تو وُہ بیوہ عورتوں اور بچّوں کی پرورش کے کام آ سکتا ہے اور یہ بڑے ثواب کا کام ہے۔“

”تمہارا یہ خیال بُرا نہیں۔ میں بُہت دنوں سے یہ سوچ رہا ہُوں کہ اگر کہیں سے کُچھ دولت ہاتھ لگ جائے تو میں یہاں ایک ہائی اسکول کھولوں جہاں غریب بچّوں کو مفت تعلیم دی جائے۔“

”آپ کے خیال میں چور کون ہو سکتا ہے؟“

”مجھے کسی پر شُبہ نہیں۔“

”پھر بھی میں یہ جانتا ہوں کہ طوطے کا بھید چور تک کیسے پہنچا؟“

ماسٹر صاحب نے میری بات پر کوئی توجّہ نہیں دی اور اسکول کی طرف چلنے کا حکم دیتے ہُوئے بولے۔

”میں آج کسور اعشاریہ پڑھاؤں گا۔ تُم خزانے کا خیال چھوڑ کر پڑھائی کی طرف دھیان دو۔“

میں اسکول کی طرف چلا گیا مگر پڑھائی کے دوران میں بھی میرا ذہن طوطے کی طرف بھٹکتا رہا۔ پہلے مُجھے اس ملازم پر شُبہ پیدا ہوا جو شاہد خان کا خط اور پنجرا لایا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے وہ خط راستے پڑھ لیا ہو۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ طوطا لا کر ہی کیوں دیتا۔

دوسرے درجے پر مائی حلیمن تھی۔ وہ نمبر داد کی بیوی کی گہری سہیلی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ مائی حلیمن نے وہ ساری باتیں سُن لی ہوں جو مجھے ماسٹر صاحب نے سُنائی تھیں۔ پھر اُس نے وہ باتیں اپنی سہیلی کو بتائی ہوں۔ اس نے اپنے خاوند کو۔

اس کے خاوند نے وہ تمام باتیں اشرف بیگ تک پہنچائی ہوں اور اشرف بیگ نے اپنے کسی آدمی کی مدد سے طوطا چرالیا ہو۔

ماسٹر صاحب کسور اعشاریہ کا طریقہ سمجھا رہے تھے مگر میں اپنے خیالات میں گُم تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اُن کی نگاہیں مُجھ پر گڑی ہوئی ہیں۔ میں نے گھبرا کر اپنی خالی کاپی کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کچھ سوال نکل کر لیے مگر طوطے کا معمّہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔

نئی مصیبت

ماسٹر صاحب کو طوطے کے چوری ہو جانے کا کُچھ زیادہ ملال نہ تھا اس لیے اس سلسلے میں ان سے کوئی بات سے چیت کرنا بے کار تھا۔ میں حکیم شاہ کے پاس پہنچا اور اسے سارا قصّہ کہہ سُنایا۔ وہ میری باتیں سُن کر بہت خوش ہوا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے ماسٹر صاحب حامِد خان کے بیٹے راشد خان ہیں۔ تف ہے مُجھ پر کہ میرے ہوتے ہوئے لوگ اُنہیں پہچانیں۔ میں اُن کے ایک ایک دُشمن کی گردن مروڑ دوں گا۔" وہ جوش میں آ کر نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔

"اتنا جوش میں آنے کی ضرورت نہیں حکیم شاہ۔ میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ کسی نے اُن کا طوطا چرا لیا ہے۔ وُہ بُہت قیمتی طوطا ہے مگر ماسٹر صاحب ماسٹر صاحب کو کچھ فکر نہیں۔ اس طوطے کی تلاش کا کام اب ہمیں کرنا ہو گا۔" میں نے اُسے اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے کہا۔

"تُم فکر نہ کرو، میں اس کام میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔" وہ خم ٹھونک کر بولا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر طوطے کو تلاش کرنے کا منصوبہ بنایا۔

تین دن اور تین راتیں ہم کھیتوں، باغوں، گلیوں اور مکانوں میں طوطے کی آواز سُننے کی کوشش کرتے رہے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ خُدا جانے اُسے زمین نِگل گئی یا آسمان کھا گیا تھا۔

چوتھے روز جب میں نے ماسٹر صاحب کو اپنی ناکامی کا حال سنایا تو وہ برا سامنہ بنا کر بولے۔

"اگر اتنی محنت حساب کے سوال سیکھنے کے لِیے کرتے تو کہیں کے کہیں پہنچ جاتے۔" اُن کے اس جواب سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی مگر میں نے بڑے ادب کے ساتھ کہا۔ "ماسٹر صاحب، اگر آپ کا طوطا نہ ملا تو ہائی اسکول جانے کا خواب کبھی پورا نہ ہو گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں طوطا تلاش کر کے ہی چین کا سانس لوں گا۔"

اُسی روز میرے کہنے سُننے پر ماسٹر صاحب نے جماعت میں اِعلان کر دیا کہ جو لڑکا اُن کا کھویا ہوا طوطا تلاش کر کے لائے گا اُسے انعام دیا جائے گا۔

اس اِعلان کا اچھا خاصا نتیجہ نکلا۔ کیوں کہ میری طرح جماعت کے دوسرے طالب علم بھی طوطے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور گاؤں کا ایک ایک کونا کھنگال ڈالا۔ مگر طوطا کہیں ہوتا تو ملتا۔ آخر سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ میری ہِمّت بھی جواب دے گئی تھی۔

کئی روز کے بعد ماسٹر صاحب نے مجھ سے کہا۔ "اب طوطے کی تلاش کا خیال دل سے نکال دو۔ تم اس فضول کام میں اپنا کافی وقت ضائع کر چکے ہو۔ اب بہتر یہی ہے کہ طوطے کا دھیان چھوڑ کر پڑھائی کی طرف توجّہ دو۔"

اس مرتبہ میں اُن کا کہا نہ ٹال سکا اور طوطے کے دھیان کو دِل سے نکال کر پڑھائی میں لگ گیا جس سے وہ بہت خوش ہُوئے۔

پہلوان آہستہ آہستہ تن درست ہو رہا تھا۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ ہم اس سے

کوئی کام نہیں لے سکتے تھے۔ اِس بے کاری سے ہماری حالت بہت پتلی ہو گئی تھی اور ہمارے گھر میں کئی کئی دن چولھا نہیں جلتا تھا۔

اِن دِنوں دادی سخت مصیبت میں گرفتار تھیں۔ وہ صُبح ہوتے ہی گھوڑے کو گاڑی میں جوڑ کر گھر سے نکل جاتیں اور آس پاس کے گاؤں میں جا کر ٹوکریاں بیچتیں یا عورتوں کے ہاتھ دیکھ کر اُنہیں قسمت کا حال بتاتیں جس کے بدلے میں اُنہیں تھوڑے بُہت پیسے مل جاتے۔ بارش کا موسم ہمارے لیے مُصیبت لاتا تھا۔ اس زمانے میں ہمارے سارے کاروبار بند ہو جاتے تھے اور فاقوں تک کی نوبت آ جاتی تھی۔ اُن دِنوں میں بڑی باقاعدگی سے اسکول جارہا تھا کیونکہ بارش کا موسم ہونے کی وجہ سے سارے کام کاج ٹھپ پڑے تھے۔ بارش کی ٹپاٹپ جماعت کے کمرے میں بھی ہمارا پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ ہم بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ سکڑے سمٹے بیٹھے پڑھتے رہتے تھے۔ ایسے موسم میں بچّوں کی حاضری کم ہوتی تھی اس لیے ماسٹر صاحب ہمارا دل بہلانے کے لیے دلچسپ کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

وہ دِن سچ مُچ بہت اداس تھے۔ دِن رات بارش برستی تھی اور سرد ہوائیں چلتی تھیں۔ اور ہمارے بدن تھر تھر کانپتے رہتے تھے۔

نیلا طوطا ابھی تک نہیں ملا تھا۔

کئی روز کی لگاتار بارشوں کے بعد جب ایک صُبح چمکتی ہوئی دھوپ نکلی اور موسم خُوش گوار ہو گیا تو میں نے اسکول سے چھُٹّی کی اور ایک بے فکرے شہزادے کی طرح حکیم شاہ کی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ وہ اندھیرے میں بیٹھا اپنی قمیص ٹانک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بناوٹی غصّے سے بولا۔

"آج کل کہاں رہتے ہو؟ کہیں دکھائی ہی نہیں پڑتے اور ہاں! اس طوطے کا کیا بنا؟ ملا یا نہیں۔"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"اگر پنجرا خالص سونے کا تھا تو اس کے ملنے کی اب کوئی اُمّید نہیں۔"

ہم کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر میں وہاں سے اُٹھ کر جنگل کی طرف گیا۔ میرا خیال تھا کہ سُہانے موسم وجہ سے برکت بھی اسکول نہیں گیا ہو گا اور جنگل کی صاف سُتھری ہوا کھا رہا ہو گا۔ مگر جب کافی تلاش کے بعد بھی وہ مجھے کہیں نہ ملا تو میں گھر واپس آ گیا اور خالی گھڑے لے کر کنوئیں کی طرف چلا گیا۔ پانی بھرنے سے پہلے کچھ دیر کو سستانے کے لیے میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ برکت آ گیا۔

"یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ ماسٹر صاحب صُبح سے کئی مرتبہ تمہارے متعلق پُوچھ چکے ہیں۔"

"ان سے کہہ دینا کہ آج میں بیمار ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم خود جا کر کہو۔ میں کیوں کہوں؟" وہ چِڑ کر بولا۔

"خیر اِسے چھوڑو اور یہ بتاؤ تُم نے میرا وہ کام کیا؟"

"ہاں! میں اپنی سی کوشش کر چکا ہوں۔"

”مگر کیا تُم لال حویلی میں بھی گئے تھے؟“

”تمھارا مطلب ہے کہ میں وہاں جا کر اپنی ہڈّی پسلی تُڑوا لیتا۔ نا بابا نا۔ میں ایک معمولی سے طوطے کے لیے اپنی جان نہیں دے سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میں نے جلدی جلدی گھڑوں میں پانی بھرا اور ایک ایک کر کے گھر لے جانے لگا۔ جب میں آخری گھڑا اُٹھانے کے لیے آیا تو وہ خالی پڑا تھا۔ حالانکہ میں سے بھر کر گیا تھا۔ میں سمجھ گیا شرارت عزیز نے کی ہو گی۔ کیوں کہ ایک روز پہلے میرا اُس سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ ماسٹر صاحب کو خانہ بدوش ماسٹر کہہ کر مجھے چڑا رہا تھا۔

عزیز پاس ہی ایک درخت کے نیچے بیٹھا ریت پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور بولا۔

”میرے گھڑے کا پانی کس نے گرایا ہے؟“

”میں کیا جانوں؟“ اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

”تمہارے سوا یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ یہ شرارت تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔“ میں غصّے سے بولا۔

”مجھ سے اُلجھنے کی کوشش نہ کرو، ورنہ گردن مروڑ دوں گا۔ خانہ بدوش کا بچّہ۔ چور۔“ اُس نے نفرت سے کہا۔

مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اُسے اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ وہ کیچڑ میں گرا اور بُری طرح لت پت ہو گیا۔ اتنی دیر میں کئی لڑکے ہمارے اِرد گِرد جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے چیخ چیخ کر تالیاں بجائیں اور میری پیٹھ ٹھونکی۔

اتنے میں نمبر دار کا لڑکا آ گیا۔ اس کا نام خالق تھا اور وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ وہ آتے ہی مجھ پر چیل کی طرح جھپٹا۔ میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے پاؤں اُکھڑ گئے اور میں بھد سے زمین پر گِر پڑا۔ اس عرصے میں عزیز بھی اپنے حواس درست کر چکا تھا۔ وہ بھی مجھ پر پل پڑا اور ان دونوں نے مل کر میری خوب پٹائی کی۔

اس وقت نذیر کہیں سے آ نکلا۔ اس نے اُن دونوں کو یہ کہہ کر میری جان چھڑائی۔ ”اسے چھوڑ دو ورنہ یہ ماسٹر صاحب سے تُم دونوں کی شکایت کرے گا اور وہ تم پر خفا ہوں گئے۔“

”اب ہمیں اُن کا کوئی ڈر نہیں۔ اب وہ جلد ہی یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائیں گے۔“ خالق اکڑ کر بولا۔ ”اور ہاں خانہ بدوش ماسٹر کو بھی ریچھ نچانے کا کام سکھا دو۔ کما کھائے گا۔“

وہ دونوں قہقہے لگاتے ہوئے چلے اور میں مُنہ بسور تارہ گیا۔

”تمہاری مار سے زیادہ مجھے ماسٹر صاحب کے جانے کا دکھ ہے۔ یہ سب برکت کا کیا دھرا ہے۔“ نذیر بڑی مایوسی کے ساتھ بولا۔

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“ اُس نے کہا۔

”اُس نے سارے گاؤں میں یہ بات پھیلا دی ہے کہ ماسٹر صاحب خان بہادُر عظمت خان کے پوتے ہیں اور پرانے محل کے مالک ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو قاسم۔ تُم بے وقوف ہو کہ اپنے ہر دوست پر بھروسا کر لیتے ہو۔ یہ بھید تمھی نے تو اُسے بتایا تھا۔ اُس نے سارے گاؤں والوں کے کانوں میں پھُونک دیا۔“

نذیر نے طعنہ دے کر میرا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔ میں بِلک بِلک کر رونے لگا۔

ماسٹر صاحب کی تمام مصیبتوں کا اصل سبب میں ہی تھا اور اسی وجہ سے ان کا سامنا کرتے ہوئے مجھے خوف آتا تھا مگر اس کے باوجود مجھے جانا پڑا۔

جب میں نے ماسٹر صاحب کو یہ سارا واقع سنایا تو وہ بھی کچھ چُپ سے ہو گئے اور دیر تک خالی خالی نِگاہوں سے مجھے گھورتے رہے۔ پھر ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹ لا کر بولے۔

”مجھے یہاں سے اپنے جانے کا غم نہیں۔ میں اپنے علم کی بدولت جہاں جاؤں گا اپنی روزی کما لُوں گا۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ علم کی روشنی پھیلانے کا جو

مقصد میں یہاں لے کر آیا تھا وہ ادھورا رہ جائے گا۔"

وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکے۔ اُن کی آواز گلے میں بندھ گی گئی تھی۔ اور میرا سینہ اس غم سے پھٹا جا رہا تھا کہ اصل مجرم میں تھا۔

طوطے کی تلاش

جب سے ماسٹر صاحب کی نوکری چھٹنے کی افواہ گاؤں میں پھیلی تھی میں تعلیم میں بُہت زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ اور مُجھے ان سے اتنی گہری عقیدت اور محبت ہو گئی تھی کہ اگر کوئی آدمی اُن کی شان میں کوئی گستاخی کی بات کہہ دیتا تو میں مرنے مارنے پر تُل جاتا۔ اسی لیے آئے دن لوگوں سے میرا جھگڑا ہونے لگا تھا۔ جب میرے لڑنے جھگڑنے کی خبر ماسٹر صاحب سُنتے تو مُجھے نصیحت کرتے ہوئے کہتے۔لوگوں سے بات بات پر نہ اُلجھا کرو قاسم۔بُہت سی باتیں ایسی بھی کہی جاتی ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اگر کُچھ لوگ ایسی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کر لیتے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔

ایک روز شام کا کھانا کھانے کے بعد جب میں اُن کی خیریت معلوم کرنے گیا تو

اُنہیں بُہت اُداس پایا۔ فوراً ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔

”کیا بات ہے؟ آج آپ اُداس دکھائی دیتے ہیں۔“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”مجھے ملازمت سے جواب مل گیا ہے۔ نمبردار چند آدمیوں کے ساتھ میرے پاس آیا تھا۔ ایک مہینے کے بعد مجھے یہ ملازمت چھوڑنی ہو گی۔“ یہ کہتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

اس خبر سے کچھ دیر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنے غم کا اظہار کروں۔ میری حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ مجھ سے بیٹھا نہ گیا۔ میں روتا ہوا باہر آ گیا اور گھر کی طرف چلنے لگا۔ راستے میں نذیر مِل گیا۔ اس نے بڑی ہمدردی سے پُوچھا۔

”کیا بات ہے، بڑے کھوئے کھوئے سے دکھائی دے رہے ہو؟“

”ماسٹر صاحب کو ملازمت سے جواب مل گیا ہے۔“ میں نے کہا اور میں پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

"مجھے بھی یہ خبر سُن کر بہت صدمہ ہوا ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ ہاں آج ہی ابّا جان نے مجھے یہ خبر سنائی ہے کہ شہر میں ایک دکان دار کسی ایک گاہک کے ہاتھ نیلے رنگ کا ایک طوطا بیچ رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ پورے ملک میں ایسا طوطا نہیں ملے گا۔"

یہ خبر سُن کر میری آنکھوں میں چمک آگئی۔ میں فوراً ہی ماسٹر صاحب کے پاس گیا اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ انہیں ہی خوش خبری سُنائی۔

"میں کل ہی ابّو کے ساتھ شہر جا کر اس کا کھوج لگاؤں گا۔" میں نے کہا۔

ماسٹر صاحب بولے۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا کیوں کہ کل اسکول بند رہے گا۔

اگلی صُبح ٹھیک نو بجے ہم شہر پہنچ گئے۔ گھوڑا گاڑی چوک کے ایک کونے میں کھڑی کر دی اور ہم پیدل چلتے ہوئے اس دُکان پر پہنچ گئے جس کا پتا نذیر نے بتایا تھا۔

یہ ایک عام سی دُکان تھی۔ ہم دونوں دُکان میں داخل ہو گئے اور اِدھر اُدھر رکھی

ہوئی چیزوں کو غور سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں دُکان دار نے ہمارے پاس آ کر پوچھا۔ ”کہیے آپ کو کون سی چیز چاہیے؟“

”مجھے ایک نیلے رنگ کے طوطے کی ضرورت ہے۔“ ماسٹر صاحب بولے۔

”وہ جو کہتا ہے اللہ میاں چوری بھیج۔“ میں نے لقمہ دیا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ دُکان دار ابھی وہ پنجرا ہمارے سامنے لا کر رکھ دے گا جس میں نیلا طوطا اِدھر اُدھر پھُدک رہا ہو گا۔ مگر جب دُکان دار نے بڑی لاپروائی سے یہ کہا کہ ہمارے پاس ایسا کوئی طوطا نہیں ہے تو میرا دل ڈوب گیا۔

اتنے میں دُکان دار کا بوڑھا باپ آ گیا اس نے ہماری باتیں سُن لی تھیں۔ وہ آتے ہی کہنے لگا۔

”ہرے رنگ کا طوطا لے لیجیے۔ طوطا تو ہر رنگ میں طوطا ہی کہلائے گا۔“ بوڑھا یہ کہہ ہنسنے لگا۔

”مگر مجھے نیلا رنگ ہی پسند ہے۔“ ماسٹر صاحب بولے۔

”افسوس کہ اس رنگ کا طوطا بِک چکا ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

ہم مایوس ہو کر دُکان سے باہر آگئے اور گاڑی کے پاس پہنچے۔ جہاں ابّو ایک شخص سے باتیں کر رہے تھے۔ ہم نے ان کی باتوں کی طرف کچھ زیادہ توجّہ نہیں دی مگر جب ابّو کی زبان پر طوطے کا لفظ آیا تو میں چونک پڑا۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس آدمی سے کہا۔

”میرا لڑکا بھی بُہت بے وقوف ہے۔ وہ ضد کر رہا ہے کہ سُرخ رنگ کا طوطا ہی لوں گا۔ اب تُم ہی کہو بھائی پھجے کہیں سُرخ طوطے بھی ہوتے ہیں۔“

”کیوں نہیں ہوتے۔ طوطے ہرے بھی ہوتے ہیں، سُرخ بھی اور نیلے بھی۔“ پھجّا گردن اکڑا کر بولا۔

”ہائیں، نیلے بھی؟ اگر یہ بات ہے تو کوّا گلابی رنگ کا بھی ہو سکتا ہے۔“ ابّو نے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں اکرم بھائی۔ کل ہی ایک نیلے رنگ کا طوطا بکا ہے۔ طوطا کیا تھا بس عجوبہ سمجھو۔"

"کون تھا اس کو گاہک؟" ابّو نے کُریدا۔

"فیروز والا گاؤں کا زمیندار ہاشم خان۔ میری بات کا یقین نہ ہو تو اس کے گھر جا کر دیکھ لو۔" پھجّا بڑے یقین کے ساتھ بولا۔

"اچھا۔ اب تو یہ طوطا دیکھنا ہی پڑے گا۔" "ہاں! ہاں۔ ضرور دیکھو اور پھر مجھے آ کر بتانا کہ میری بات سچّی تھی یا جھوٹی؟"

"مگر راستہ بُہت لمبا ہے۔"

"پانچ چھ کوس کا فاصلہ بھی کوئی فاصلہ ہوتا ہے۔ پھر تمہارے پاس گھوڑا گاڑی ہے۔" پھجّا ہِمّت بندھاتے ہوئے بولا۔

"اچھا بھائی پھجّے، پھر ملاقات ہو گی۔" ابّو نے جلدی جلدی پھجّے سے ہاتھ ملا کر

جان چھڑائی اور ہمیں گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”جلدی گاڑی میں بیٹھیے ماسٹر جی۔ ہمیں بہُت لمبا سفر کرنا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہم ابھی فیروز والا جائیں گے۔ ورنہ بعد میں جانے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔“

ہم جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی دھیرے دھیرے چلنے لگی۔

پَن چکی سے آگے نکلنے کے بعد شہری آبادی ختم ہو گئی۔ سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے کھیت آنکھوں کو تازگی بخش رہے تھے۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا دکھائی دے رہا تھا۔ اکتوبر کا مہینا ہونے کے باوجود موسم خاصا گرم تھا۔

گھوڑا گاڑی میں سفر کرتے ہوئے اُونگھ جانا میری پرانی عادت تھی۔ میں جلد ہی ایک طرف کو لُڑھک گیا۔ جب ایک سخت جھٹکے سے آنکھ کھلی تو سورج آسمان کے مغربی کونے میں ڈوب رہا تھا اور اس کی کرنوں سے وہاں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ابّو سے پوچھا۔ ”ابھی کتنا سفر باقی ہے؟“

انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کو جواب دیا۔ ”شاید ہم راستے سے بھٹک آئے ہیں۔۔۔میرا تو خیال ہے یہیں رُک کر کچھ کھا پی لیں۔ پھر آگے چلیں گے۔“

گاڑی رک گئ اور ہم تینوں نیچے اُتر کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ پھر ابّو نے ایک پوٹلی کھولی۔ اُس میں کچھ روٹیاں، پیاز، نمک اور آم کے اچار کی کچھ پھانکیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے یہ تمام چیزیں ایک رومال پر پھیلا دیں اور کچھ جھینپتی ہوئی آواز میں ماسٹر صاحب سے کہا۔ ”کھایئے ماسٹر جی۔ غریبوں کا کھانا بھی کھا کر دیکھیے۔ کتنا مزیدار ہے۔“

میں سمجھتا تھا کہ ماسٹر صاحب ہمارے کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے مگر اُنہوں نے فوراً ہی ایک روٹی پر اچار کی ایک پھانک رکھی اور مزے لے کر کھانے لگے۔ مگر دو چار لقموں کے بعد ہی اُن کے گلے میں پھندا لگ گیا، گلے کی نسیں پھُول گئیں اور آنکھیں باہر کو نکلنے لگیں۔ تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہم پانی کا انتظام کے بغیر ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔

میں فوراً ہی لوٹا اُٹھا کر ایک طرف کو بھاگ گیا۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک کنواں نظر آ گیا جس کی چرخی کے ساتھ بندھا ہوا ڈول منڈیر پر رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پانی کھینچا اور لوٹا بھر کر بھاگتا ہوا واپس آ گیا۔ پانی پینے کے بعد ماسٹر صاحب کی جان میں جان آئی۔

کھانا کھا کر ابّا اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔ ''اب چلنا چاہیے۔''

''مگر ابّو، آپ نے تو کہا تھا کہ ہم بھُول گئے ہیں۔'' میں نے اُنہیں یاد دلایا۔

''ہاں، اس وقت میرا یہی خیال تھا مگر اب کھانا کھانے کے بعد میری آنکھوں میں روشنی آ گئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں۔ بھُوک میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ گدّی پر بیٹھے اور گھوڑے کی باگ سنبھال لی۔ میں اور ماسٹر صاحب بھی گاڑی میں سوار ہو گئے اور گھوڑا دھول میں اَٹی ہوئی سڑک پر دھیرے

دھیرے دھیرے چلنے لگا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ گھُپ اندھیرے میں آسمان پر ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک طرف سے چاند جگمگاتی طشتری کی طرح اُبھرا۔ اس کی روشنی سے پورا جنگل جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ چاندنی کا صحیح لُطف دُور دُور تک پھیلے ہوئے کھُلے میدانوں ہی میں آتا ہے اور یہی چاندنی جنگل میں سفر کرنے والوں کو راستہ دکھاتی ہے۔

آگے پیچھے کئی موڑ مُڑنے کے بعد ایک لکڑی کے پُل سے گزرے اور ہمیں ایک چھوٹا سا گاؤں دکھائی دیا۔ گاؤں کے پاس پہنچ کر گاڑی رُک گئی اور ابّو نے نیچے اُتر کر باگیں گھوڑے کی پیٹھ پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "ہماری منزل آگئی ہے۔ آؤ اب سو جائیں۔ صُبح اُٹھ کر طوطے کو تلاش کریں گے۔"

میں رات بھر سوتا ہوا آیا تھا اس لیے اب مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں قریب ہی ایک ندّی بہہ رہی تھی جس کے ہلکے ہلکے

شور سے رہی سہی نیند بھی اُچاٹ ہو گئی۔ ابّو لیٹتے ہی سو گئے اور خرّاٹے لینے لگے تھے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کروٹیں بدلنے کے بعد آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اُٹھ کر ایک طرف کر چل دیا۔ پورا گاؤں چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ خُدا جانے ہاشم خان زمیندار کا مکان کہاں ہو گا؟ میں نے دِل ہی دِل میں سوچا اور آگے بڑھتا رہا۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک اُونچی سی دیوار تھی جس میں دو دروازے تھے۔ چلتے چلتے میں نے ایک چھوٹا سا پُل پار کیا اور اُن مکانوں کے پاس جا پہنچا جو دیوار کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ پھر ایک موڑ مُڑنے کے بعد اب ایسی پگڈنڈی پر چلنے لگا جس پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ شاید یہ جگہ ندی کا خشک حصّہ تھی۔

بائیں ہاتھ کی طرف اندھیرے میں ایک چھوٹی سی گلی تھی جس کے دونوں طرف مکانوں کی قطاریں تھیں۔ میں گلی میں چلتا ہوا ایک چھوٹے چوراہے پر پہنچا۔ قریب ہی ایک چھوا سا جوہڑ تھا۔ جس میں چودھویں کے چاند کا عکس جگمگا رہا تھا۔ دلدل کی وجہ سے یہاں زمین کچھ نرم تھی اور ہر طرف سڑے ہوئے پانی کی بدبُو

پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک اپنے کاندھے پر میں نے کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ خوف کے مارے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے بجلی کی سی پھرُتی سے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور یہ دیکھ کہ میری جان میں جان آئی کہ وہ ماسٹر صاحب تھے۔

"تمہاری طرح مجھے بھی نیند نہیں آرہی تھی اس لیے میں بھی اُٹھ کر تمہارے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ معلوم ہوتا ہے تم نے ابھی طوطے کی تلاش کا کام شروع کر دیا ہے۔"

"آہستہ بولیے۔ کوئی سُن نہ لے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"یہ تو اچھا ہی ہوگا کہ کوئی ہماری آواز سن لے۔ ہمیں کسی چھت کے نیچے سونے کا موقع مل جائے گا۔ ورنہ کھلے آسمان کے نیچے لیٹنے کے بعد تو صبح تک میری رگوں میں خون جم جائے گا۔" وہ زور زور سے بولتے رہے۔

یکایک ایک پاس والے مکان کی کھڑکی سے دیے کی ہلکی ہلکی روشنی چھن کر باہر آئی اور اس کے ساتھ ہی کسی نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

"باہر کون ہے؟"

"ہم مسافر ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھُلا اور ایک دیہاتی ہاتھ میں لاٹھی پکڑے ہوئے باہر آیا۔
"اتنی رات گئے یہاں کیوں گھوم رہے ہو؟" اس نے گھورتے ہوئے پُوچھا۔

"ہم کسی جگہ رات گزارنے کا ٹھکانا تلاش کر رہے ہیں۔" ماسٹر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مگر اتنی رات گئے آپ کو سونے کی جگہ کہاں ملے گی؟" وہ حیران ہو کر بُدبُدایا۔

"سونے کی جگہ تو رات ہی کو تلاش کی جاتی ہے۔" ماسٹر صاحب نے مُسکرا کر جواب دیا۔

وہ کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں ایک چھوٹی سی سرائے میں لے گیا جہاں ہمیں سونے کو جگہ مل گئی۔ اس وقت ہمیں یہ سرائے شہر کے بڑے سے

بڑے ہوٹل سے زیادہ آرام دہ نظر آئی۔ ہم ایک کمرے میں دو گندے بستروں پر زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ کمرہ کوڑے کرکٹ سے بھرا ہوا تھا۔ شاید وہاں بُہت دِنوں سے کوئی نہیں سویا ہو گا۔ جبھی تو اُس کی صفائی کی طرف کسی نے توجّہ نہیں دی تھی۔

تکیے پر سر رکھتے ہی مجھے نیند آگئی اور صبح کے وقت اُس وقت آنکھ کھُلی جب سورج کی تیز کرنیں سوئیوں کی طرح میرے جسم میں چُبھ رہی تھیں۔

ماسٹر صاحب اس وقت کھڑکی کے پاس ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے دل بہلا رہے تھے۔

ابھی ہم وہاں جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ سرائے کا ملازم لسّی کے دو گلاس رکھ کر چلا گیا جو ہم نے غٹ غٹ پی لیے۔ کچھ دیر بعد جب وہی ملازم خالی گلاس واپس لینے کے لیے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پنجرا تھا جس میں نیلے رنگ کا طوطا پھُدک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن بند ہوتے ہوتے رہ گئی۔

ماسٹر صاحب کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔ ''بھئی تمہارا یہ طوطا تو بُہت خوب صورت ہے۔ میں نے آج تک ایسا طوطا نہیں دیکھا۔''

''جی ہاں، یہ طوطا ہاشم خان زمیندار کا ہے۔ دو دن ہوئے اُنہوں نے شہر سے خریدا تھا۔ وہ اس سرائے کے مالک بھی ہیں۔'' ملازم نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں بتا دیں۔

''میاں مٹّھو چوری کھاؤ گے؟'' میں نے طوطے سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہ سُنتے ہی چونک اُٹھے گا اور اپنے مالک کو پہچان لے گا۔ مگر اس نے بالکل ہی طوطا چشمی دکھائی اور میری بات پر کان نہیں دھرا۔

ملازم بولا۔ ''میاں لڑکے، یہ طوطا گونگا ہے۔ بات کرنا تو رہا الگ، ٹیں ٹیں بھی نہیں کرتا۔'' یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

مجھے یوں لگا جیسے اس کی ہنسی میرے دماغ پر ہتھوڑے لگا رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنے کان بند کر لیے۔ پھر ہم نے جلدی جلدی رات بھر کا کرایہ ادا کیا اور

مایوسی میں ڈوبے ہوئے ابّو کے پاس واپس آ گئے۔

کتابوں کا تحفہ

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم طوطے کی تلاش میں ناکام رہے؟“ حکیم شاہ نے مجھے چڑاتے ہوئے کہا۔

”یونہی سمجھ لو۔“ میں سر ہلا کر بولا۔

”کوئی اور ترکیب سوچو۔“

”ہر ترکیب ناکام ہو چکی ہے۔“

”تمہارے ماسٹر صاحب کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”کچھ نہیں۔ وہ بالکل نااُمّید ہو چکے ہیں اور جانے کی تیّاری کر رہے ہیں۔“

تیّاری کا لفظ زبان پر آتے ہی مُجھے ماسٹر صاحب یاد آ گئے۔ وہ کئی دن سے اپنا سامان ٹھیک ٹھاک کر رہے تھے اور ابھی تک تیّاری مکمّل نہ ہو پائی تھی حالانکہ ان کے

پاس کتابوں کے ایک صندوق کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

"میں ماسٹر صاحب کا سامان بندھوانے جا رہا ہوں۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

ماسٹر صاحب کا کمرہ دیکھ کر میرا دل بہت دُکھا۔ ماسٹر صاحب کے ساتھ ساتھ مائی حلیمن کو بھی ملازمت سے جواب مل گیا تھا۔ اس لیے اب وہاں کوئی صفائی کرنے والا نہیں تھا اور ہر طرف کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب وہیں بیٹھے ہوئے کتابیں چھانٹ رہے تھے۔

"آپ نے تمام کتابیں صندوق میں رکھ لی ہیں؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی تو میں کتابیں چھانٹ رہا ہوں۔ ضروری کتابیں رکھ لوں گا۔ باقی یہیں چھوڑ دوں گا۔ زیادہ بوجھ اُٹھانا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ بکھری ہوئی کتابوں پر نظریں جمائے ہُوئے بولے۔

"اس کام میں تو بہت وقت لگے گا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں

گا۔"

یہ کہہ کر میں نے بکھری ہوئی کتابیں سمیٹنی شروع کر دیں اور چھانٹی ہوئی کتابیں احتیاط کے ساتھ صندوق میں جمانے لگا۔ اچانک میری نظر ایک تلوار پر پڑی۔

"یہ تلوار کس کی ہے؟" میں نے حیرت سے پُوچھا۔

"اسے بھی صندوق میں رکھ دو۔ یہ میرے بزرگوں کی نشانی ہے۔ قلم سے کام لینے والا آدمی تلوار سے کام نہیں لے سکتا۔" اُنہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

اُن کے چہرے پر غم کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ میں نے ان کے اُداس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چند ہی دِنوں میں آپ کی صحت کتنی خراب ہو گئی ہے۔"

"بے کاری کِسی کو راس نہیں آئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا مقصد ادھورا رہ گیا اور میں اس گاؤں کے لوگوں کے لیے کوئی اچھا کام نہ کر سکا۔"

”ایسا نہ کہیے۔ یہ آپ کی نہیں اُن لوگوں کی بد قسمتی ہے جو آپ کے نیک مقصد کی قدر نہیں کر سکے۔ آپ کی بڑائی کو نہیں پہچان سکے۔“

”کِس بڑائی کی بات کر رہے ہو قاسم؟ میں تو بُہت معمولی انسان ہوں۔ انسانوں کا ایک ادنیٰ خادم۔۔۔۔“

اُن کے لہجے میں ایک ٹوٹے ہوئے دِل کی دھڑکن مُجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرا دل بھر آیا اور پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ میں نے آستین سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

”میں صندوق بند کرنے کے لیے کیلیں اور ہتھوڑی لے کر ابھی آتا ہوں۔“

میں سیدھا حکیم شاہ کے ہاں پہنچا جہاں ایسی چیزیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اس سے دونوں چیزیں لینے کے بعد میں چلنے ہی لگا تھا کہ اُس نے مُجھے خرگوش کا شکار کھیلنے کی دعوت دی۔ یہ سنتے ہی میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں کیوں کہ مجھے خرگوش کا شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ شکاری کُتّوں کے ساتھ رات کے اندھیرے

میں اُونچے نیچے راستوں اور گھنے جنگلوں سے گزرنا بُہت لُطف دیتا ہے۔

"تم کہاں شکار کھیلو گے؟" میں نے پوچھا

"اشرف بیگ کی شکار گاہ میں۔ وہاں خرگوش بُہت ہیں۔" حکیم شاہ نے مُسکرا کر کہا۔

"لیکن وہاں تو شکار کھیلنا منع ہے۔" میں نے سہم کر کہا۔ "اگر چوکیدار نے دیکھ لیا تو؟"

"یہ تُم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں خود نبٹ لُوں گا۔" حکیم شاہ بولا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں بھاگتا ہوا سیدھا گھر پہنچا۔ اور اوزار ابّو کے حوالے کر کے حکیم شاہ کے ساتھ شکار کھیلنے چلا گیا۔

ہم نے رات بھر خُوب شکار کھیلا اور جب حکیم شاہ کا تھیلا شکار کے جانوروں سے اچھی طرح بھر گیا تو ہم نے واپسی کی ٹھانی حالانکہ رات کا کچھ حصّہ ابھی باقی تھا۔

چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جب میں چلتے چلتے کسی اور راستے پر جانِکلتا تو حکیم شاہ مُجھے پکڑ کر سیدھے راستے پر ڈالتا اور جھنجلا کر کہتا۔ "آنکھیں کھول کر چلو ورنہ ٹھوکر کھا کر کسی کنوئیں میں گِر پڑو گے۔"

میں نہ جانے کب تک اسی حالت میں چلتا رہا۔ ہوش اس وقت آیا جب دھند میں لپٹا ہوا ایک سایہ اچانک میرے سامنے آکر دیوار کی طرح کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر بے کار۔

شکار گاہ کے چوکیدار کے بھاری بھرکم ہاتھ میری گردن تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے گھبرا کر حکیم شاہ کو آواز دی مگر اس کا دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ وہ اپنی جان بچا کر بھاگ چکا تھا۔

اگرچہ میرے پاس شکار کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے مُجھے ملزم گردانا جا سکتا لیکن اس کے باوجود میرے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور میں سر سے

پاؤں تک پسینے میں شرابور تھا۔

"آج میں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں کون تمہیں میرے چنگل سے بچاتا ہے۔ بہت دِنوں سے تمہارے پیچھے لگا ہوا تھا مگر تُم ہر مرتبہ مجھے جُل دے کر صاف نِکل جاتے تھے۔" چوکیدار دانت پیستے ہوئے بولا۔

چوکیدار کا جسم لمبا تڑنگا اور ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ اس کے سامنے میں بُہت چھوٹا اور کمزور دِکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑی بے رحمی سے مجھے گھسیٹتا ہوا ایک کُٹیا میں لے گیا جو اس جنگل میں بنی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی نے دیے کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں میرا چہرہ غور سے دیکھا تو وہ بولا۔

"کم بخت چھوکرا مجھے جُل دے کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میں کب چوکنے والا تھا۔ اب اس سے اچھی طرح نپٹ لوں گا۔" ابھی تک میری آنکھوں میں نیند تھی اور مُجھے یُوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بُہت بھیانک خواب دیکھ رہا ہُوں۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں نے اپنا سر چارپائی کی پٹی کے ساتھ ٹکا دیا۔

چوکیدار کی بیوی کو شاید مُجھ پر رحم آگیا۔ وہ بولی ”سو لینے دو بے چارے کو۔ کیوں اس پر اتنا ظلم ڈھا رہے ہو؟“

”تم اس چور کو بے چارہ کہہ رہی ہو۔ یہ دوسروں کی شکار گاہ میں چوری چھُپے شکار کھیلتا ہے۔ اب میں اسے اس چوری کا اچھی طرح مزہ چکھاؤں گا۔ خیر گولی مارو۔ مجھے تھوڑی سی چائے تیّار کر دو۔ سردی کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔“

چوکیدار کی بیوی نے اُسی وقت چولھے میں آگ جلائی اور رات کا رکھا ہوا دودھ گرم کرنے کے بعد چائے کی پتیلی چڑھا دی۔ میں پھر اُونگھنے لگا کیونکہ آگ کی حرارت سے میرے تھکے ہوئے بدن کو آرام مل رہا تھا۔ چوکیدار کو شاید کوئی کام یاد آگیا تھا۔ وہ مجُھے وہیں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اس کی بیوی نے جلدی سے گلاس میں دودھ انڈیلا اور میرے مُنہ سے لگا دیا۔ دودھ خاصا گرم تھا مگر میں مُنہ جلنے کی پروا کیے بغیر غٹا غٹ پی گیا۔

گرم گرم دودھ نے میرے بدن میں بجلی سی دوڑا دی۔ میری بگڑتی ہوئی حالت

سنبھل گئی اور میں اپنے جسم میں اتنی طاقت محسوس کرنے لگا کہ بڑی سے بڑی مُصیبت کو جھیل لینا بھی میرے لیے کُچھ مشکل نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد چوکیدار کُٹیا میں آگیا اور گرج کر بولا۔ ''اُٹھو''

''اسے کہاں لے جارہے ہو؟'' چوکیدار کی بیوی نے پُوچھا۔

''زمیندار کے پاس۔'' چوکیدار نے جواب دیا اور مُجھے بازُو سے پکڑ کر دھکیلتا ہُوا کُٹیا سے باہر آگیا۔ صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا اور سورج کی سُنہری کرنیں درختوں کی پھُنگیوں پر تھِرک رہی تھیں۔ میں چوکیدار کے ساتھ ایک بے بس قیدی کی طرح سر جھکائے چلا جارہا تھا۔ جب میری چال کُچھ دھیمی پڑ جاتی تو وہ ایک ٹھوکا لگا کر مجھے آگے کی طرف دھکّا دیتا اور میں تیز تیز چلنے لگتا۔

جب ہم گاؤں کے قریب پہنچے تو مُجھے برکت دکھائی دیا۔ وہ ایک ٹیلے پر صُبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا رہا تھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور اس انداز سے ہاتھ ہلایا جیسے پُوچھ رہا ہو۔ ''کیا بات ہے؟''

اسے دیکھ کر میری کُچھ ہِمّت بندھی۔ میں نے ہاتھوں کے اشارے سے اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں چوکیدار کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔ کسی طرح اس سے میرا پیچھا چھُڑاؤ۔

اس نے اِشاروں سے مُجھے حوصلہ رکھنے کی ہدایت کی اور یقین دِلایا کہ وہ مجھے چوکیدار کے چنگل سے نجات دِلانے کی کوشش کرے گا۔ اُدھر میں سوچنے لگا کہ میں نے ایسا کون سا جُرم کیا ہے جس پر مجھے کوئی پھانسی پر چڑھا دے گا۔ زیادہ سے زیادہ چوری کے الزام میں مجھے جیل میں بھیجا جا سکتا ہے۔ اس سے میرا کیا بگڑ جائے گا۔ میرے ابّو چوری کے الزام میں کتنی مرتبہ جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ مگر کیا جیل میں جانے کے بعد وہ چوری کرنے سے باز آ گئے؟ ہم خانہ بدوشوں کے لیے جنگل کی ہوا اور جیل کی ہوا میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بستیوں میں ہمیں کون سا آرام ملتا ہے کہ ہم جیل جانے سے گھبرائیں۔

مجھے اور تو کِسی بات کی فکر نہیں تھی، رہ رہ کر اپنی امّی کا خیال آتا تھا جو ایسے موقعوں پر بہت جلد گھبرا جاتی تھیں اور رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیتی تھیں مگر اب

اِن تمام باتوں کے بارے میں سوچنا ایک سِرے سے بیکار تھا کیونکہ میں چوکیدار نے ہتھّے چڑھ گیا تھا اور اس نے مُجھ سے گِن گِن کر بدلے لینے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ آخر چلتے چلتے ہم لال حویلی کے پاس پہنچ گئے جہاں چوکیدار نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور باہر تالا چڑھا دیا۔ یہاں اور بھی بہت سی کوٹھڑیاں تھیں جن میں اشرف بیگ کی حویلی میں کام کرنے والے مُلازم رہتے تھے۔ کوٹھڑی میں ایک جھلنگا سی چارپائی پڑی تھی۔ میں اندر پہنچتے ہی اس پر لیٹ گیا اور جلدی ہی گہری نیند سو گیا۔

کافی دیر سونے کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو کوئی شخص چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”کل۔۔۔ہمیشہ کل۔۔۔ تمہاری کل کبھی آج میں تبدیل نہیں ہوتی۔“

آواز کچھ جانی پہچانی تھی مگر میں فوراً ہی اُسے پہچاننے میں کامیاب نہیں ہوا۔ پھر بھی میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ آواز ساتھ کی کوٹھڑی سے آرہی ہے۔ شاید وہ بھی کوئی مُجھ جیسا ہی بدنصیب قیدی تھا۔

کُچھ دیر یہ دردناک آوازیں سُننے کے بعد میں دوبارہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح کے وقت میری آنکھ کھلی۔ یہ صبح بھی گزری ہوئی صبح کی طرح اداس اور ویران تھی۔ میں بیدار ہو جانے کے باوجود چارپائی پر لیٹا رہا۔ اس کے سوا میں اور کر بھی کیا سکتا تھا؟

لیٹے لیٹے اچانک میری نظر اس سوراخ پر پڑی جو ساتھ والی کوٹھڑی کی دیوار میں تھا اور جسے میں نے پہلے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ جب میں نے چارپائی سے اُٹھ کر اس سوراخ کو قریب سے جا کر دیکھا تو مجھے یُوں لگا جیسے کوئی شخص اس سوراخ کے راستے پہلے ہی مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے سُوراخ کے ساتھ آنکھیں لگا کر اُسے دیکھنا چاہا تو وہ فوراً ہی پیچھے ہو گیا۔ میں پھر واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اب بھوک ستانے لگی تھی اور میں ناشتے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا مگر باہر ہر طرف سنّاٹا تھا اور کہیں سے ایسی کوئی آہٹ سُنائی نہیں دے رہی تھی جس سے دِل کو ڈھاریں بندھتی۔ میں غصّے میں آ کر دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے لگا

مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ یوں لگتا تھا جیسے باہر کی ساری دنیا گونگی ہے۔

آخر تھک ہار کر چارپائی پر واپس آ کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک اُسی وقت پاس کی کوٹھڑی سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ میں لپک کر اُٹھا اور دیوار کے سوراخ کے راستے کوٹھڑی کے اندر جھانکنے لگا۔ اس کوٹھڑی میں کسی شخص کا سایہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

مُجھے وہاں کھڑے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میری کوٹھڑی کا دروازہ ہلکی سے چرچراہٹ کے ساتھ کھُلا۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُچھلا اور اپنی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کل والا آدمی چُپکے سے ناشتہ رکھ کر واپس جانے لگا۔ لیکن اچانک وہ ٹھٹکا اور آنکھیں نکال کر پوچھنے لگا۔

"تُم دروازہ کیوں پیٹ رہے تھے؟" "مُجھے بھوک لگی تھی۔"

"آئندہ ایسی حرکت کرو گے تو بھوکے مرو گے۔ یہاں تمہارے باپ نے ہوٹل نہیں کھول رکھا ہے کہ ہر وقت تمہارے کھانے کا خیال رکھا جائے۔"

”مگر مُجھے یہاں کسی لیے بند کیا گیا ہے؟ مُجھے جانے کیوں نہیں دیتے؟“ میں ایک سانس میں بُہت سی باتیں کہہ گیا۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ زمیندار صاحب کا حکم ہے۔ اُن کی شکار گاہ میں چوری شکار کیوں کھیلا تھا؟“ وہ چلتے ہوئے بولا۔

”جانے سے پہلے میری چھوٹی سی بات سُنتے جاؤ۔“ میں نے اسے آواز دی۔

”جلدی بولو۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“

”مجھے کاغذ اور پنسل کی ضرورت ہے۔“

”کیوں؟ کیا کسی کو خط لکھنے کا ادارہ ہے۔“

”نہیں، ذرا حساب کے سوال حل کر کے دِل بہلاؤں گا۔“

”اچھا کوشش کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

میں عجب مُصیبت میں گرفتار تھا۔ نہ باہر جانے کا کوئی راستہ تھا اور نہ اندر کوئی

آرام کی صُورت۔ بے زبان پرندے کی طرح پنجرے میں بند تھا جو نہ اُڑ کر کہیں جا سکتا ہے اور نہ فریاد کر سکتا ہے۔ پورا دن اِسی اُدھیڑ بن میں گزر گیا اور اب شام پڑ رہی تھی۔

رات کو وہی آدمی پھر کھانا لے کر آیا۔ وہ پنسل اور کاغذ لانا بھُول گیا تھا۔ کل لانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

اگلی صُبح وہی آدمی ناشتے کے ساتھ پنسل اور کاغذ بھی لے کر آیا۔ میں نے اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''ساتھ والی کوٹھڑی میں کون بند ہے؟''

''کوئی تمہارا ہی بھائی بند ہو گا۔ چور اور اٹھائی گیرا۔'' اُس نے جل بھُن کے جواب دیا اور باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کاغذ پر دو تین سطریں لکھیں اور پھر بتّی بنا کر سُوراخ کے راستے ساتھ والی کوٹھڑی میں سرکا دیا۔ ساتھ والی کوٹھڑی کے آدمی

نے وہ بتی کھینچ لی اور سوراخ سے مُنہ لگا کر چُپکے سے پُوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''پڑھ کر دیکھو۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں اَن پڑھ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

یہ سن کر مجھے بہُت افسوس ہوا۔ اس روز پہلی مرتبہ میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ اَن پڑھ ہونا کیسی بد قسمتی کی بات ہے۔

اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس سے باتیں کیسے کروں؟ اگر باہر کسی نے ہماری باتیں سُن لیں تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے ہم پر کڑی نگرانی شروع کر دی جائے۔ پھر بھی میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''تمہیں یہاں کیوں بند کیا گیا ہے؟''

''میں ایک چور کا پیچھا کرتا ہُوا یہاں تک آ گیا تھا اور دھر لیا گیا۔'' ''کون تھا وہ چور؟''

”میں چور سے تو واقف نہیں۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ اُس نے ماسٹر صاحب کے گھر سے نیلے رنگ کے طوطے کا پنجرا اٹھایا تھا اور لال حویلی کے اندر لے جا رہا تھا۔“

”تمہیں یقین ہے کہ طوطا لال حویلی میں ہے؟“

”میں اس کے متعلّق کُچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اُسی دن سے لال حویلی کے ملازموں نے مجھے پکڑ کر یہاں بند کر رکھا ہے۔“

اب سارا معاملہ میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ یقین ہو گیا کہ یہ چوری ماسٹر صاحب کی نوکرانی مائی حلیمن اور نمبر دار کی سازش سے ہوئی ہے۔ کیوں کہ اُن کی ملی بھگت کے بغیر طوطے کی چوری اتنی آسانی سے نہیں ہو سکتی تھی۔

مجھے وہاں رہتے ہوئے تین دن اور تین راتیں گُزر چُکی تھیں اور میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ نہ جانے میرے اچانک گُم ہو جانے سے میرے گھر والوں پر کیا بیت رہی ہو گی۔

گھر والوں کی یاد کے ساتھ ہی مجھے ماسٹر صاحب کی یاد بھی آئی۔ اُن کے بارے

میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ ابھی گاؤں میں ہی ہیں یا جا چکے ہیں۔

اُسی شام کو جب میرا کھانا پہنچا تو اس کے ساتھ ہی تین کتابیں اور کچھ مٹھائی بھی ملی۔ میں نے اُس آدمی سے پوچھا۔ ''یہ مٹھائی اور کتابیں کس نے بھیجی ہیں؟''

''گاؤں کا ایک بچّہ دے گیا تھا۔ مُجھے اس کا نام معلوم نہیں۔'' اُس آدمی نے جواب دیا اور پھر چلا گیا۔

مٹھائی کا ڈبّا اور کتابیں لینے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا کہ گاؤں میں مجھ پر اتنا مہربان کون ہو گا جس نے میرے لیے یہ تحفہ بھیجا ہے مگر دماغ پر کافی زور دینے کے باوجود میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

مٹھائی کھانے کے بعد وقت گزارنے کے لیے میں کتابوں کے ورق اُلٹنے لگا اور جلدی ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ تینوں کتابیں میں نے ماسٹر صاحب کے ہاں دیکھی تھیں۔

Bari

اب میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ تحفہ ماسٹر صاحب نے ہی کسی ترکیب سے بھیجا تھا۔ یہ جان کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ اس سے بات سے یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ ماسٹر صاحب ابھی تک گاؤں ہی میں ہیں۔

کتابیں بُہت پرانی تھیں اور ان کی جلدیں جگہ جگہ سے اُکھڑی ہوئی تھیں۔ کتابوں کے کاغذ کا رنگ بھی پھیکا پڑ چکا تھا۔

میں نے کتابوں کو آستین سے صاف کر کے پڑھنا شروع کیا۔ چند صفحات پڑھنے کے بعد پتا چلا کہ اِن کتابوں میں عظمت خاندان کی پوری تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ تینوں کتابیں اصل میں ایک بڑی کتاب کے تین حصّے تھے جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ عظمت خاندان کے لوگ کون تھے اور کہاں سے آ کر اس علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ پرانا محل کب بنا تھا، کِس نے بنوایا تھا اور اس پر کیا لاگت آئی تھی۔

پہلی کتاب کے شروع کے صفحوں میں اُن ہتھیاروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں جو اس خاندان کے بزرگ اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ میں ان

ہتھیاروں کی تصویریں پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ یہ تصویریں پرانے محل کے صدر دروازے پر بنی ہوئی تھیں۔

انہیں تصویروں میں ایک صفحے پر ایک ڈھال کی تصویر تھی جو چار حصّوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ڈھال کے اُوپر کے دائیں حصّے میں ایک برج کی تصویر تھی اور ہو بہو اُس بُرج سے ملتی جلتی تھی جو پرانے محل میں بنا ہوا تھا۔ اوپر کے دائیں حصّے میں عقاب کی تصویر تھی جس نے اپنے پنجوں میں ایک چھڑی رکھی تھی۔ نچلے بائیں حصّے میں ایک تلوار کی تصویر تھی اور نچلے دائیں حصّے میں بھی کوئی شکل بنی ہوئی تھی۔ جسے میں پہچان نہ سکا۔ اس تصویر کی حقیقت جاننے کے لئے میں نے کتاب کو اچھّی طرح اُلٹ پلٹ کر دیکھا مگر کُچھ پلّے نہ پڑا۔ ڈھال کے نیچے کچھ لکھا ہوا بھی تھا۔ لیکن اُس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ تنگ آ کر میں نے دُوسری کتاب کو پڑھنا شروع کیا اور ایک دم میرے ذہن پر سے پردے سے ہٹنے لگے۔ اب ساری گتھی سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔

خزانہ

دُوسرے دِن صُبح کو ناشتا کرنے کے بعد میں پھر کتابیں لے کر بیٹھ گیا اور چوتھی تصویر کو سمجھنے کے لیے سر کھپانے لگا۔ کبھی تو مجھے وُہ گول سا چکّر دکھائی دیتی۔ کبھی چھتری کی تصویر اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ میں دیر تک اُسے گھورتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد یہ خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے دماغ میں آیا اور میں خوشی سے پاگل ہو اُٹھا۔ میں نے چوتھی تصویر کا بھید معلُوم کر لیا تھا اور اُس کے ساتھ ہی طوطے کی گتھّی بھی حل ہو چُکی تھی۔

ڈھال کے نقشے میں جو عقاب کی تصویر بنی ہوئی تھی وہ عُقاب نہیں بلکہ طوطا تھا وہی طوطا جس کی تلاش میں ہم زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ طوطے کے سامنے ہی بُرج کی تصویر تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ خزانہ برج میں کسی جگہ دفن ہے اور ڈھال کا نقشہ اس خزانے کی کنجی ہے جسے خاندان ہی کا کوئی شخص حاصل کر سکتا

تھا۔

اب مُجھے اِطمینان ہو چکا تھا کہ اشرف بیگ اُس وقت تک خزانہ حاصل نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ اس کے پاس ڈھال کا نقشہ نہ ہو۔ لیکن پھر بھی میں چاہتا تھا کہ فوراً ہی ماسٹر صاحب کے پاس پہنچ کر انہیں خزانے کا راز بتاؤں مگر یہ کیسے ممکن تھا؟ میں تو کوٹھڑی میں بند تھا اور اس قید سے بھاگ نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا اور میری پلکیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

یہ کتنے رنج کی بات تھی کہ مجھے خزانے کا راز معلوم ہو چکا تھا مگر میں اُسے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی اب مُجھے یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر یہ بھید ماسٹر صاحب کے دُشمنوں کو بھی معلوم ہو گیا تو وہ آسانی سے خزانے کا کھوج لگا لیں گے۔

مجھے اپنی بے بسی پر بہت غُصّہ آ رہا تھا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ میں نئی نئی ترکیبیں سوچ رہا تھا مگر ہر ترکیب کی تان اس بات پر ٹوٹتی

تھی کہ سب سے پہلے مجھے اس قید خانے سے باہر نکلنا چاہیے۔

وہ رات تو میں نے جیسے تیسے گزاری مگر رات ہی رات میں اس مُصیبت سے چھُٹکارا حاصل کرنے کی ترکیب بھی میں نے سوچ لی تھی۔ اس میں خطرہ تو تھا مگر اب میں ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیّار تھا۔

اگلی صبح میں ناشتہ لانے والے آدمی کے قدموں کی آہٹ پر کان لگا کر بیٹھ گیا اور جُونہی اُس نے دروازہ کھول کر اندر آنے کی کوشش کی میں نے پوری طاقت سے دھکّا دے کر اُسے نیچے گرا دیا اور خود سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھا۔ اس نے بُہت شور مچایا مگر اب کسی کی مجال تھی کہ میرے قریب بھی پھٹک سکتا۔ میں زندگی اور موت کی بازی لگا کر بھاگ رہا تھا۔

میں تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا اسکول میں گھس گیا جہاں ماسٹر صاحب دروازے کی طرف پیٹھ کیے کچھ پڑھ رہے تھے۔

"ماسٹر صاحب، میں آ گیا ہوں۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ میری سانس

دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

”ارے تم آ گئے! مُجھے یقین تھا تُم ضُرور آؤ گے۔“اُن کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔

”بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں اور آپ کے لیے خوش خبری لایا ہوں کہ میں نے اس جگہ کا پتا لگا لیا ہے جہاں آپ کے بزرگوں کا خزانہ دبا ہوا ہے۔“

”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ ٹھنڈا پانی پیو۔ طبیعت بحال ہو جائے گی۔“ انہوں نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ ”اِدھر دیکھیے۔“ میں نے اُنہیں ڈھال کا نقشہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ رہا طوطا۔۔۔ یہ رہا بُرج۔۔۔ اور یہ رہا بُرج کے اندر خزانہ۔۔۔ ہمیں فوراً خزانے کا کھوج لگانا چاہیے۔“

میری بات اُن کی سمجھ میں آ گئی۔ ”ہو سکتا ہے تمہارا خیال ٹھیک ہو۔“ وہ کُچھ سوچتے ہوئے بولے۔

”خیال ہی نہیں، مجھے یقین ہے کہ خزانہ بُرج میں ضرور ہو گا۔“

”مگر خزانے کا کھوج لگانے سے پہلے تمہیں چوکیدار سے جان بچانی چاہیے۔ وہ تمہارا پیچھا کر رہا ہو گا۔“ انہوں نے مجھے یاد دِلایا۔

ان کا خیال ٹھیک تھا۔ میں خزانہ حاصل کرنے کی دھن میں اتنا مگن تھا کہ قید سے بھاگنے کے بارے میں مجھے کچھ یاد ہی نہ رہا۔ خزانے کی تلاش رات کے وقت ہی کی جا سکتی تھی مگر سوال یہ ہے کہ مجھے رات ہونے تک کہاں چھپنا چاہیے؟ ابھی ہم اس کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اُچھل کر الماری کے اندر چھُپ گیا۔ ماسٹر صاحب دروازے کی طرف گئے تو مجھے نذیر کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”قاسم قید سے بھاگ نکلا ہے۔ چوکیدار کچھ آدمیوں کے ساتھ اس کے باپ سے پوچھ گچھ کرنے گیا ہے۔ میں نے اُن لوگوں کو اس کے مکان کی طرف جاتے دیکھا ہے۔“

مجھے نذیر پر پورا بھروسا نہیں تھا مگر جب اُس نے ماسٹر صاحب کو یہ بتایا کہ اگر قسم

مجھے اِس وقت مل جاتا تو میں اُسے ایسی جگہ چھُپا دیتا جہاں چوکیدار کے فرشتے بھی اسے تلاش نہ کر سکتے تو میں جھٹ الماری سے باہر نکل آیا۔"

"تم مجھے کہاں چھپانا چاہتے ہو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

اس نے میری بات کا جواب دیے بغیر اپنے کوٹ کے بٹن کھولے، ایک رومال اور اونی ٹوپی مجھے دی اور پھر بولا۔ "یہ ٹوپی اوڑھ لو اور رومال اس طرح لپیٹ لو کہ تمہارا چہرہ چھپ جائے۔ پھر اس طرح میرے پیچھے بھاگو جیسے ہم کھیل رہے ہیں۔ میں بھاگتا ہوا اپنے گھر کی طرف جاؤں گا۔ لو اب جلدی کرو۔"

میں نے اُس کے کہنے پر عمل کیا۔ خُوش قسمتی سے راستے میں کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔ اور میں نذیر کے پیچھے بھاگتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے مُڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو مجھے اِس بات کا اِطمینان ہو گیا کہ کوئی ہمارا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔

نذیر کے مکان کے پیچھے ایک چھت والی گاڑی کھڑی تھی۔ اس گاڑی میں اُس

نے مجھے چھپا دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر چکر کاٹنے کے بعد ان نے واپس آ کر مجھ سے پوچھا۔ ”سُناؤ کیا حال ہے؟ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟“

”بالکل ٹھیک ہوں۔ یہاں تو کوئی پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا۔ تم نے خُوب ٹھکانا تلاش کیا۔ جواب نہیں۔“

”چُپکے بیٹھے رہو۔ زیادہ بولنا ٹھیک نہیں۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

”مگر تم نے مجھ پر اتنی مہربانی کیوں کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ایک بھاگے ہوئے چور کو پناہ دینا بھی تو جرم ہے۔ زمیندار تمہاری جان کا لاگو ہو جائے گا۔“

”دوست کی مدد کرنا دوست کا فرض ہے اور پھر تُم نے کیا ہی کیا ہے۔ تمہارا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم ماسٹر صاحب کے ہم درد ہو، جنہیں نہ اشرف پسند کرتا ہے اور نہ نمبر دار۔“

ہم دونوں نے وہ دوپہر بڑے مزے سے گزاری۔ نذیر کھانے پینے کی بہت سی چیزیں اپنے ساتھ لے آیا تھا جو میں نے پیٹ بھر کر کھائیں۔ کھانا کھانے کے بعد

جب طبیعت بحال ہو گئی تو میں نے نذیر سے کھُل کر باتیں کیں۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری طرح وہ بھی ماسٹر صاحب کا وفادار شاگرد ہے۔ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ ماسٹر صاحب ہمارے گاؤں میں ایک ہائی اسکول بنانا چاہتے ہیں تو وہ بہُت خوش ہوا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں بھی اُن کی طرح پڑھ لکھ کر ماسٹر بنوں گا۔ بچّوں کو پڑھانا بڑا دلچسپ کام ہے۔" اُس کی آنکھیں مسرّت سے چمک اُٹھیں تھیں۔

شام کے وقت نذیر اپنے گھر چلا گیا۔ وہ واپسی میں ماسٹر صاحب سے مل کر آیا تھا۔ انہوں نے اُسے بتایا کہ "ابھی تک خیریت ہے مگر چوکیدار کے آدمی قاسم کی تلاش میں ہیں۔ اُسے چوکنّا رہنا چاہیے۔"

جب رات کا اندھیرا اچھی طرح پھیل گیا تو میں بھیس بدل کر ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجُھے دیکھ کر اُن کی ساری پریشانی دور ہو گئی۔ "بھُوک لگی ہو تو کچھ کھالو۔" انہوں نے کہا۔

”نذیر نے مُجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلایا ہے۔ ہاں یہ بتایئے گھر والوں کو میری خیریت کا پتا چل چکا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں نے اُنہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ فکر نہ کرو۔“

بُرج کی طرف جانے سے پہلے میں نے ماسٹر صاحب کو بتایا کہ وہ بُرج کی سیڑھیوں پر احتیاط سے قدر رکھیں۔ کیونکہ اس کی بُہت سی اینٹیں اپنی جگہ سے ہلی ہوئی ہیں۔ ذراسی بے احتیاطی سے آدمی کا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ پوری احتیاط سے کام لیں گے۔ پھر انہوں نے کئی موم بتّیاں اپنی جیب میں رکھیں اور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

رات کو ٹھیک گیارہ بجے ہم بُرج کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے کچھ دیر رُک کر یہ اطمینان کیا کہ کوئی جاگ نہ رہا ہو۔ پھر تیزی سے ہال کمرے سے گزرتے ہوئے بُرج کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئے۔

”ذرا دھیان سے اُوپر چڑھیے۔“ میں نے کہا۔

اُنھوں نے موم بتّی جلاتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں ہوشیار ہوں۔“

ہم دونوں آگے پیچھے بُرج کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے اور آخر بُرج کی آخری منزل میں پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور اس میں ہوا کے لیے ایک سوراخ تھا۔ اُسے میں نے فوراً ہی رُومال سے بند کر دیا تاکہ موم بتّی کی روشنی باہر نہ نکلے۔ یہاں ہر طرف ملبہ پڑا ہوا تھا۔ آگ لگنے کی وجہ سے چھت کئی جگہ سے گِر گئی تھی اور ان سوراخوں میں سے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، خُفیہ راستہ بائیں طرف ہے اور اس کا دروازہ دیوار میں ہونا چاہیے مگر یہ دروازہ تلاش کرنا کافی مشکل کام ہے۔“ ماسٹر صاحب اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولے۔

دروازہ تلاش کرنے کے لیے ہمیں ملبے کے ڈھیر صاف کرنے پڑے۔ پھر کہیں جا کر ایک بڑا سا پتھّر دکھائی دیا مگر وہ اتنا بھاری تھا کہ ہم دونوں کافی زور لگانے کے

باوجود اُسے نہ ہٹا سکے۔ماسٹر صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے اور بولے۔ ”مُصیبت کی بات یہ ہے کہ ہر دروازے پر خفیہ تالے لگے ہوئے ہیں اور مجھے اُن کو کھولنے کا طریقہ نہیں آتا۔“

”میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چوتھی تصویر کا کیا مطلب ہے؟ تین تصویریں تو میں پہچانتا ہوں۔ایک بُرج، دوسرا طوطا اور تیسری تلوار۔ مگر چوتھی تصویر؟“

”چوتھی تصویر کُنجی کو ظاہر کرتی ہے۔“ ماسٹر صاحب دھیرے سے بولے۔

”یہ پتھر بہُت بھاری ہے۔ اسے اپنی جگہ سے ہٹانا ہمارے لیے نا ممکن ہے۔ اب ہمیں کوئی اور راستہ تلاش کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

بُرج کی دیواریں بہُت خستہ ہو چکی تھیں۔ ہم نے کئی جگہوں سے دیواروں کو ٹھونک ٹھانک کر دیکھا کہ زمین پر پلسترِ گرنے کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

”ہو سکتا ہے خزانہ اس ڈھیر کے نیچے چھپا ہو۔“ میں نے اینٹوں کے ٹکڑوں اور ٹوٹے ہوئے شہتیروں کے ایک بڑے سے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ ہمیں ایک ایک اینٹ اُکھاڑ کر دیکھنی ہو گی۔" انہوں نے مایوسی سے کہا۔

اچانک مجھے چمنی کا خیال آیا جو کافی بڑی تھی۔ میں پھُرتی سے اُس کے اندر داخل ہو گیا اور گھوم پھر کر اُوپر نیچے دیکھتا رہا۔ مگر بے فائدہ۔

"میں تو نااُمّید ہو چکا ہوں۔" وہ سر ہلا کر بولے۔

"مگر میں ابھی نا اُمید نہیں ہوں۔ میں آخری دم تک اپنی کوشش کروں گا۔" میں نے بڑے جوش سے کہا اور ایک طرف پڑے ہوئے ملبے کے ڈھیر کو ہٹانا شروع کیا۔ اچانک مُجھے اپنے ہاتھوں کے نیچے کُچھ محسوس ہوا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دِل کے ساتھ موم بتّی لا کر اُس کی روشنی میں نیچے جھُک کر دیکھا اور خُوشی سے پاگل ہو کر چیخ اُٹھا۔ "اِدھر دیکھئے۔ اِدھر دیکھئے۔"

مُجھے طوطے کے بیٹھنے کا اڈّہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے درمیان میں ایک

گڑھا سا تھا مگر وہ مٹّی سے پُر تھا۔ میں نے ناخنوں سے مٹّی صاف کی تو اُس کے نیچے ایک درز دِکھائی دی۔ ماسٹر صاحب میرے پاس آ گئے تھے اور اس درز کو بڑی دِلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"تم نے کُچھ نہ کُچھ سُراغ پالیا ہے۔" وہ مُسکراتے ہوئے بولے۔

پھر انہوں نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر اُس کا پھل درز میں داخل کر دیا۔ مگر چاقو کا پھل بُہت چھوٹا تھا۔ وہ کافی اندر نہ جا سکا۔ ہم پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور دیر تک سوچتے رہے۔ اچانک میری نگاہ دیوار پر بنی ہوئی ایک تلوار پر پڑی اور میرے مُنہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ "اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ چاقو کے پھل سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں تلوار کی ضرورت پڑے گی۔"

"تلوار کی؟" انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ فکر نہ کرو۔ میں اپنی حفاظت کے لیے تلوار بھی ساتھ لے آیا تھا۔ وہ نیچے پڑی ہے۔ ٹھہرو ابھی لے کر آتا ہوں۔"

وہ بھاگتے ہوئے نیچے اُترے اور پلک جھپکتے میں تلوار لے کر اوپر آ گئے۔ تلوار کا

درز کے اندر داخل ہونا تھا کہ دیوار کا سامنے والا حصّہ ہلکے سے شور کے ساتھ دروازے کی طرح کھُل گیا۔ ہم دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ تکتے رہ گئے۔ مُجھے ابھی تک اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں کوئی سُہانا سپنا دیکھ رہا ہوں۔ مگر جب میں نے زور سے اپنے جسم میں چُٹکی بھری تو درد سے بِلبِلا اُٹھا اور مُجھے اپنے جاگنے کا یقین آ گیا۔

دیوار کے اندرونی حصّے میں لوہے کا ایک بڑا سا صندوق رکھا ہوا تھا جس کے کنڈوں میں بھاری تالے لگے ہوئے تھے۔ صندوق پر ایک خط رکھّا ہوا تھا جسے ماسٹر صاحب نے جلدی سے کھول کر پڑھا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔ یہ خط اُن کے نام تھا اور اس کا مضمون یہ تھا۔

"اگر زندگی بھر تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی میرا بھتیجا اس معمولی سی گتھی کو نہ سلجھا سکے تو یہ ساری دولت، جو میں نے اُس کے لیے یہاں چھُپا کر رکھی ہے، اس شخص کا حق ہے جو اِسے پانے میں کامیاب ہو جائے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میرے بھتیجے نے اپنے آپ کو اس دولت کا حق دار ثابت نہیں کیا۔ اور

ساتھ ہی اُس نے اس خاندانی اصول پر عمل نہیں کیا جس کا مطلب ہے کہ اپنی مدد آپ کرو۔"

"میرے چچا نے مجھے اپنی مدد آپ کرنے کا سبق بڑے اچھّے طریقے سے دیا ہے۔" ماسٹر صاحب نے مُسکرا کر کہا۔ پھر انہوں نے خط میرے ہاتھ سے لے کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور اُسے چومتے ہوئے بولے۔ "اب ہمیں اس خزانے کو یہاں سے لے جانے کا انتظام کرنا ہو گا۔"

مِل گیا

خزانے کو ماسٹر صاحب کے گھر تک پہنچانے میں ساری رات لگ گئی۔ صندوق میں سونے چاندی کی اینٹیں اور زیور تھے۔ جنہیں ایک دم لے جانا آسان کام نہیں تھا۔ آخری مرتبہ جب ہم خزانے کا باقی حصّہ لے کر گھر پہنچے تو صبح ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

تھکن سے چور ہو کر میں چارپائی پر گِر پڑا اور تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد بولا۔ ”میری تو ہڈّیاں چکنا چور ہو گئی ہیں۔“

”تکلیف کے بعد ہی راحت ملتی ہے۔ اب اس دولت سے میں اِسی گاؤں میں ایک ہائی اسکول کھولوں گا اور ان بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفے دوں گا جو تمہاری طرح غریب ہیں۔“

”مگر آپ مجھے اپنے اسکول میں نہیں پائیں گے۔ مُجھے تعلیم حاصل کرنے کا کوئی

شوق نہیں ہے۔ ویسے بھی میں ایک خانہ بدوش کا بچّہ ہوں جس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔"

"نہیں تمہیں میرے اسکول میں ہر قیمت پر پڑھنا ہو گا۔ یہ خزانہ جو ہم نے حاصل کیا ہے اس میں آدھا حصّہ تمہارا ہے۔ اگر تُم میرا ہاتھ نہ بٹاتے تو میں کبھی اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہوتا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ میری بات سے ماسٹر صاحب کو دُکھ ہوا ہے جبھی تو الفاظ اُن کے مُنہ سے رُک رُک کر نکل رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ "میں ضرور پڑھوں گا مگر ایک شرط ہے۔ آپ نذیر کو بھی وظیفہ دیں گے۔ اسے پڑھنے کا بُہت شوق ہے اور وہ پڑھ لکھ کر آپ کی طرح ماسٹر بننا چاہتا ہے۔" "بُہت خُوب۔ مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ میں ایسے شاگردوں کو ہی پڑھانا چاہتا ہوں جو تعلیم حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہوں۔"

ہم ساری رات جاگتے کامیابی پر اِتنے خُوش تھے کہ ہم پر تھکن کا معمولی سا اثر بھی

نہیں تھا اور نیند بھی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔

میں نے چائے تیار کی اور ماسٹر صاحب میرے قریب ہی کرسی بچھا کر بیٹھ گئے۔ ابھی ہم نے چائے کی پیالیاں مشکل منہ سے لگائی ہوں گی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اُنہوں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو چوکیدار کھڑا نظر آیا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی چیخ اُٹھا۔

"تم یہاں بیٹھے ہو اور میں تمہاری تلاش میں گاؤں کا کونا کونا چھان چُکا ہوں۔"

پھر اچانک اس کی نگاہ خزانے کے صندوق پر پڑی تو حیرت سے اُس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"ماسٹر جی۔ آپ کو تو شاید کہیں سے سونے کی کان ہاتھ لگ گئی ہے؟"

"یہ میرے چچا کی دولت ہے جو وہ میرے لیے چھوڑ گئے ہیں۔" ماسٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"آپ کا اشارہ شاہد خان کی طرف ہے جنہیں یہاں سے گئے ہوئے مدّت گُزر چکی ہے؟" وہ بڑے ادب سے بولا۔

"ہاں ہاں۔ وہی جن کا تعلّق عظمت خاندان سے تھا۔" میں نے چوکیدار کو چڑاتے ہُوئے کہا۔

"تو کیا ماسٹر جی اُسی خاندان سے ہیں؟" چوکیدار نے حیرت سے پوچھا۔

"باون تولے پاؤ رتّی۔ چوکیدار بادشاہ۔" میں اکڑ کر بولا۔

چوکیدار کے ہونٹوں پر چُپ سی لگ گئی تھی۔ وہ دیر تک کھویا کھویا سا کھڑا رہا۔ میں پوچھا۔ "اور ہاں، اس آدمی کا کیا بنا جو میری ساتھ والی کوٹھڑی میں بند تھا؟"

"وہ بھی تمہاری طرح جُل دے کر بھاگ نِکلا۔ شاید تم دونوں نے اکٹھے ہی صلاح کی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تُم تو میرے ہاتھ لگ گئے ہو۔ چلو اُٹھو۔"

"چوکیدار، یہ خیال اپنے دِل سے نکال دو۔ اب اس بچّے کو یہاں سے دُنیا کی کوئی

طاقت نہیں لے جا سکتی۔ تُم تو کیا تمہارا مالک بھی اِس کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔" ماسٹر صاحب سے بھر کر بولے۔

چوکیدار ماسٹر صاحب کے غُصّہ سے سہم گیا۔ بولا۔ "معاف کر دیجیے۔ میں اس لڑکے کو نہیں لے جاؤں گا۔ میری نوکری کا معاملہ نہ ہوتا تو کبھی اِسے پریشان نہ کرتا۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ لیجئے میں جا رہا ہوں۔"

ماسٹر صاحب کو اس پر رحم آ گیا۔ اُنہوں نے چوکیدار کو کُچھ پیسے دیے۔ وُہ بُہت خوش ہُوا اور دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد اور کئی مِلنے جُلنے والے آئے۔ اُن میں نذیر بھی تھا۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا اور ماسٹر صاحب سے بولا۔

"آج گاؤں میں ہر طرف یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ آپ کو اپنا خاندانی خزانہ مِل گیا ہے۔"

"افواہیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔" ماسٹر صاحب نے مُسکراتے ہوئے

کہا۔

”اب گاؤں والوں کو اپنی غلطی کا پتا چلا ہے کہ وہ عظمت خاندان کے ایک آدمی کے ساتھ کتنا بُرا سلوک کرتے رہے ہیں۔ بُہت سے لوگ یہ درخواست لے کر آپ کے پاس آنے والے ہیں کہ آپ گاؤں چھوڑ کر نہ جائیں۔“

”میں نے کبھی یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ میں اب بھی بچّوں کو پڑھاؤں گا۔ مگر اپنے اسکول میں۔ میرا اسکول بُہت جلدی بن کر تیار ہو جائے گا۔“ میں نے نذیر کو پچھلی رات کی ساری کہانی سنائی۔ اسے اس بات کا بہت افسوس ہوا کہ وہ اس مہم میں ہمارے ساتھ کیوں نہ شریک ہوا۔ ہم کافی دیر تک گپیں ہانکتے رہے۔ پھر وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ لڑکا آ گیا جو میرے ساتھ والی کوٹھڑی میں بند تھا۔ اس کا نام بُندو تھا۔ اُسے بھی اشرف بیگ کے ملازموں نے پکڑ کر کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا اور وہ بھی میری ترکیب پر عمل کر کے وہاں سے نِکل بھاگا تھا۔

بُندو کے جانے کے بعد مجھے اپنے گھر والے یاد آئے اور میں ماسٹر صاحب سے اجازت لے کر فوراً ہی اپنے گھر کی طرف بھاگ نِکلا۔ ابّو اور امّی مُجھے دیکھ کر بہت خُوش ہوئے۔ خاص طور پر امّی نے چٹ پٹ بلائیں لیں۔ دادی نے بھی پوپلے مُنہ سے مُجھے خوب دعائیں دیں اور آیندہ کبھی شکار گاہ کی طرف نہ جانے کی ہدایت کی۔ اُن سے مِل جل کر میں پھر ماسٹر صاحب کے پاس آگیا جہاں مجھے حکیم شاہ دِکھائی دیا۔ وہ بڑی محبّت سے ماسٹر صاحب سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اور ہکلا ہکلا کر کہہ رہا تھا۔

”پیارے راشو۔ مُجھے افسوس ہے تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا۔ جب سے تمہارا نیلا طوطا گُم ہوا ہے، میں دن رات اُس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میری خواہش تھی کہ طوطا حاصل کر کے تم سے ملتا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔“

میں نے اسے بتایا۔ ”طوطا لال حویلی میں یہ خبر بُندو سے ملی ہے مگر وہاں پہنچنا جان جوکھوں کا کام ہے۔“

”راشو، تم نے لکھنا پڑھا کر قاسم کر بُہت ہوشیار بنا دیا ہے۔ اب تو یہ بڑوں بڑوں کے کان کاٹتا ہے۔“

حکیم شاہ کے تعریفی لفظوں میں کچھ ایسی مٹھاس تھی کہ نیند کے مارے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور میں کرسی پر بیٹھتے ہی گہری نیند سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو دروازے پر شور مچ رہا تھا اور اُسی وقت میں نے حکیم شاہ کو تیزی سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بُری طرح لہولہان ہو رہا تھا اور نیلے طوطے کا پنجرا اُس کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔ طوطے کی حالت بہت خراب تھی۔

اس وقت یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ پہلے کس کی دیکھ بھال کی جائے۔ حکیم شاہ کے چہرے اور ہاتھوں سے خُون ٹپک رہا تھا اور طوطا بھُوک سے نڈھال تھا۔ اس کے پَر نیچے کی طرف جھکے ہوئے تھے اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔

ماسٹر صاحب نے فوراً ہی حکیم شاہ کی مرہم پٹّی کی اور طوطے کو چوگا دیا۔ طوطا

چہکنے لگا۔ ''اللہ میاں چوری بھیج۔''

حکیم شاہ نے اپنی داستان سناتے ہوئے کہا ''جب میں چھُپتا چھُپاتا چوروں کی طرح لال حویلی کے اندر داخل ہوا تو ایک کُتّے کی نظر مُجھ پر پڑ گئی۔ وہ زور سے بھونکا۔ اُس کی آوازے سُنتے ہی دوسرے کُتّے بھی خبر دار ہو گئے اور بھونکتے ہوئے مجھ پر جھپٹے۔ اُن کے ساتھ ہی کُچھ ملازم بھی میری طرف لپکے۔ مگر میں اُس وقت تک طوطے کا پنجرا اپنے قبضے میں کر چکا تھا۔ میں سر پر کفن باندھ کر گیا تھا راشو۔ اگر آج میں طوطا نہ لا سکتا تو میری لاش ہی وہاں سے نکلتی۔ ان لوگوں نے دُور تک میرا پیچھا کیا مگر میں اُن کے ہاتھ نہ آیا۔ خُدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنا وعدہ نبھایا۔ نیلا طوطا تمہارے سامنے ہے۔ اِسے اپنے خاندان کے ایک پُرانے نمک خوار کا ناچیز تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔''

بارہ سال بعد

ماسٹر صاحب کو خزانہ ملے پورے بارہ سال گزر چکے ہیں۔ لیکن اُس زمانے کی یاد ابھی تک میرے ذہن میں یوں تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو۔ اُن کا ہائی اسکول خوب چل رہا ہے اور شاید ہی گاؤں کا کوئی بچہ ایسا ہو جو وہاں نہ پڑھتا ہو۔ پُورے صوبے میں اِس اسکول کی شہرت پھیل چکی ہے اور ہر شخص کی زبان پر ماسٹر صاحب کا نام ہے۔

ہم پُرانے محل سے اُٹھ کر ایک چھوٹے سے مکان میں آ گئے ہیں جسے امّی ہر وقت آئینے کی طرح صاف ستھرا رکھتی ہیں۔ ہر جمعے کو ماسٹر صاحب ہمارے گھر آتے ہیں اور ہم اکٹھے بیٹھ کر شام کا کھانا کھاتے ہیں۔

میرے ابّو بوڑھے ہو جانے کی وجہ سے زیادہ تر گھر میں ہی رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی میلے ٹھیلے میں نکل جاتے ہیں۔ میری دادی، خدا اُنھیں جنّت نصیب کرے،

فوت ہو چکی ہیں۔ اُنہیں شہر سے واپس آتے ہوئے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔

میرے بچپن کا ساتھی نذیر اُسی اسکول میں ماسٹر ہے۔ رہا میں تو میں بھی اُسی اسکول میں ماسٹر ہوں مگر ماسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ میری تعلیم ابھی ادھوری ہے۔ مجھے ابھی اور علم حاصل کرنا ہے۔

حکیم شاہ کبھی کبھی یہ کہہ کر میرا مذاق اُڑاتا ہے۔ ”تمہیں تعلیم سے کیا حاصل ہوا؟ بٹیر پکڑنے کے لیے تم ٹھیک سے جال بھی نہیں پھیلا سکتے۔“

برکت ایک زمیندار کے ہاں نوکر ہے۔ وہ آج بھی میرے تعلیم حاصل کرنے کے شوق کی بُرائی کرتا ہے۔ میں اُسے چِڑانے کے لیے اس سے سوال کرتا ہوں ۴x6 کتنے ہوتے ہیں؟

اور وہ مُنہ بنا کر جواب دیتا ہے۔ ”میں تو نہیں جانتا مگر اپنی بھیڑ بکریوں کے گلّے کو اچھی طرح گِن سکتا ہوں اور اس کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں۔“

”اور اب تمہارے دُشمن کس حال میں ہیں؟“ آپ مُجھ سے یہ سوال کریں گے تو

میں آپ کو صاف صاف بتا دُوں کہ اب ہمارا کوئی دُشمن نہیں۔ کچھ لوگ جو ہمارے دُشمن تھے، دوست بن چُکے ہیں۔ نمبر دار فوت ہو چکا ہے۔ اشرف بیگ آج کل حج کو گیا ہے اور وہ دشمنی جو عظمت خاندان اور اس کے درمیان ایک دیوار بنی ہوئی تھی، اب ختم ہو چکی ہے۔ اور ہاں ایک بات تو رہ ہی گئی۔ ماسٹر صاحب نے اپنا گھر بسا لیا ہے۔ پانچ سال ہوئے اُن کی شادی اشرف بیگ کی لڑکی سے ہوئی تھی اور اب اُن کے ہاں خیر سے دو بچّے ہیں۔